BIHAR URDU ACADEMY

مارچ ۲۰۲۴ء

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

ساحؔر لدھیانوی

رباعیات

انداز محبت کا جدا ہوتا ہے
ہر درد پہ سو شکر ادا ہوتا ہے
ہر حال میں رہتا ہے جو راضی برضا
بندہ وہی مقبول خدا ہوتا ہے

محنت کا زمانہ میں بڑا پایہ ہے
کاہل کا وجود نخل بے سایہ ہے
تسلیم کرے گی ساری دنیا اس کو
محنت ہی جہاں کے لئے سرمایہ ہے

اصغر امام فلسفی

اصغر امام فلسفی ابن حکیم مولانا عبدالرحمٰن کے اسلاف اتر پردیش سے ہجرت کر کے بہار آئے تھے۔ اصغر امام ۲۶ ستمبر ۱۹۰۲ء کو محلّہ پیرویس (پیر باعث لین) عالم گنج، پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے زیادہ حالات زندگی دستیاب نہیں، مگر جو کچھ ان کے بارے میں لکھا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مرفہ حال علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اساتذہ میں مولانا سید کفایت حسین اور مولانا سید عبدالخبیر جیسی شخصیتوں کے نام شامل ہیں۔ اصغر امام فلسفی نوجوانی کے دنوں سے ہی مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے رہنماؤں سے متاثر ہو کر تحریک آزادی میں شامل ہو گئے تھے۔ اس کی پاداش میں انہیں ۱۹۴۲ء کے آس پاس جلاوطن بھی ہونا پڑا، مگر بالآخر سبھاش چندر بوس کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے اور آزادی ملنے کے بعد وہ کانگریس کی حمایت میں سرگرم کار رہے۔ انہوں نے پارٹی کے لئے مختلف کتابچے تیار کئے، نظمیں لکھیں اور عملی تحریکات میں بھی حصہ لیتے رہے۔ ان تمام سرگرمیوں کا اثر ان کی شاعری پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اصغر امام فلسفی کی وفات ۲۱/مارچ ۱۹۹۷ء کو ہوئی۔ میر شکار ٹولی قبرستان، پٹنہ میں دفن ہوئے۔ فلسفی کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۵ء میں ہوا۔ ان کے دو مجموعے ''گلزار فلسفی'' اور ''افکار فلسفی'' اشاعت یافتہ ہیں۔
انہوں نے ''امارت شرعیہ'' کے ترجمان ''نقیب'' کی ادارت کا فریضہ بھی مدتوں انجام دیا۔

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

مدیر
ابرار احمد خان
سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر
انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۵ شمارہ : ۳
مارچ ۲۰۲۴ء

زرتعاون : پندرہ روپے
سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ: سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476
Web : www.biharurduacademy.in
email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

کمپوزنگ : پروین اشرفی
تزئین : زیبا پروین

فہرست

اداریہ	حرف آغاز	ابراراحمد خان	۳
ذکرِ ساحرؔ	انسانی قدروں کا نقش گر: ساحرؔ لدھیانوی	ڈاکٹر صابر علی سیوانی	۴
	وادیٔ عشق کا شاعر: ساحرؔ لدھیانوی	فخرالدین عارفی	۱۱
	عبدالحئی ساحرؔ گیتوں اور نظموں کے آئینے میں	صادق علی انصاری	۲۰
	ساحرؔ لدھیانوی کی نظمیہ شاعری	آفتاب احمد	۲۲
	ساحرؔ: پل دو پل کا شاعر	ڈاکٹر فائزہ احمد	۲۷
	سب سے اونچا ساحرؔ تیرا نام رہے	نتن پربھاکر مہاجن	۳۰
مقالات	خواجہ حسن نظامی: پھلواری شریف پٹنہ میں	سید محمد نیر رضوی	۳۱
	ادب کا ایک گمشدہ ورق: شمسؔ کرائے پرسرائیوی	حلیم صابر	۳۸
	نظم 'ایک لڑکا': وقت اور ماضی کا تفاعل	عبیدالرحمٰن	۴۰
	منور رانا: سفاک عہد کا معصوم شاعر	محمد معتصم باللہ	۴۴
افسانے	آج پھر جینے کی تمنا ہے	مسرور تمنا	۴۷
	ببول کا سایہ	محمد طارق	۴۹
انشائیہ	قطار	طبیب احسن تابش	۵۱
منظومات	مناجات / نعت پاک	شکیلؔ ہاشمی / مشتاقؔ سیوانی	۵۳
	روشن اندھیرے	نیازؔ جیراجپوری	۵۴
	دو نظمیں	سلیم انصاری	۵۵
	غزلیں	حافظ کرناٹکی / رئیسؔ احمد نعمانی	۵۶
	غزلیں	ندیمؔ جعفری	۵۷
	غزلیں	خورشیدؔ دلدارنگری	۵۸
	غزلیں	شمسی قریشی / عمران عظیمؔ	۵۹
	غزلیں	ظفرؔ صدیقی	۶۰
کتابوں کی دنیا	ناشادؔ اورنگ آبادی — محمد حسنین انصاری	مبصر : ڈاکٹر آصف سلیم	۶۱
	سبد گل — محمد حفیظ الدین ماجدؔ	مبصر : ڈاکٹر منورؔ راہی	۶۳
	خوشبو کی آواز — خوشبوؔ پروین	مبصرہ : رابعہ خاتون	۶۵
سلام و پیام	توصیف احمد، حشمت آرا سید، عاقب محمد، شکیلؔ سہرامی، محمد زبیر احمد		۷۰

بچوں کا زبان وادب

۷۳ —— ۸۰

''زبان وادب''میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ

حرف آغاز

شکر و سپاس مالک کائنات کا —— اکادمی مجلّہ ''زبان و ادب'' کی تازہ اشاعت حاضر ہے۔''ذکر ساحؔر'' سے آغاز پانے والے اس شمارے میں حسب موضوع ساحؔر لدھیانوی کو کہیں ''انسانی قدروں کا نقش گر'' اور ''وادیٔ عشق کا شاعر'' بتاتے ہوئے خاص سوانحی نکات، فلمی دنیا سے اس کی وابستگی کے نوع بنوع ثمرات، اس کے افکار ونظریات، اس کی انسانی دوستی، اس کے یہاں ترقی پسندی کے فلسفہ کی تفہیم، استحصال زدہ طبقوں کی منظر کشی، باہمی اخوت کے سبق، فلمی نغمات میں ادبیت کے ہمہ حال تحفظ کا ذکر ہوا ہے اور خوبصورت تخلیقی زبان کا استعمال کرتے ہوئے امریتا پریتم کے بیانات، ساحؔر کی شاعری پر اس کے حیات معاشقہ کی لطیف نفسیاتی جھلکیوں کے اشارے، جذبات کی پیش کش میں اس کے انفرادی انداز اور فلمی وانقلابی شاعری کے برجستہ حوالے آئے ہیں تو کہیں ساحؔر کو ''گیتوں اور نظموں کے آئینے میں'' دکھایا گیا ہے اور ''ساحؔر کی نظمیہ شاعری'' کے تعلق سے یہ بتایا گیا ہے کہ رومانی و احتجاجی رنگ وآہنگ کے ساتھ اس نے ترقی پسندی کو کس طرح اشتراکیت سے زیادہ رومانیت کے قریب لانے میں کامیابی پائی ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ اس حصہ میں جہاں ''ساحؔر: پل دو پل کا شاعر'' بن کر آیا ہے، وہاں اس کے فلمی نغموں کی فکری وشعری خصوصیات بھی آئینہ کی گئی ہیں اور شاعری کی زبان میں اس البیلے فنکار کو منظوم خراج پیش کرتے ہوئے یہ تمنا بھی کی گئی ہے کہ ''سب سے اونچا ساحؔر تیرا نام رہے۔''

بعدازیں ''مقالات'' کے تحت ایک طرف ضروری حوالوں کے ساتھ خواجہ حسن نظامی کی سوانحی اور ادبی خدمات کا اجمالی ذکر کرتے ہوئے خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ سے ان کی ارادت وعقیدت اور یہاں ان کی تشریف آوری کے تاریخی معلوماتی حال واحوال قلم بند کئے گئے ہیں اور تمنؔا عمادی کے شاگرد، بھولے بسرے شاعر ''شمسؔ کرائے پرسرائیوی'' کو ان کے عہد وسوانح اور نمونہ کلام کے ساتھ یاد کیا گیا ہے تو دوسری طرف اختر الایمان کی مشہور نظم ''ایک لڑکا'' کا جامع تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے، اس میں ''وقت اور ماضی کا تفاعل'' مبرہن ہوا ہے اور منؔور رانا کی شاعری کے متنوع موضوعاتی افادات و اضافات پر نظر ڈالتے ہوئے انہیں ''سفاک عہد کا معصوم شاعر'' بتایا گیا ہے۔

مزید برآں اس شمارے میں جہاں محبت بھری خوبصورت کہانی ''آج پھر جینے کی تمنا ہے'' ایک غریب لڑکی لتا اور ایک نابینا فقیر روشن کے کردار سے رومانی جذبے اور حسین فنی بنت کے ساتھ یہ دکھاجاتی ہے کہ آواز کا سحر کس غضب کا ہوتا ہے اور نیک جذبے سے کس طرح کامیابی کی راہ کھلتی ہے، وہیں افسانہ ''ببول کا سایہ'' ایک بدکردار باپ کی زندگی کے دوررس اثرات کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے اور سماجی فکر میں ایک ناروا احتیاط کے حوالے سے عصری اصلاحی پیغام بھی دے جاتا ہے۔

مذکورہ مشمولات کے ساتھ ساتھ ہمیں امید ہے کہ اس شمارے میں انشائیہ ''قطار'' بھی اپنی شگفتگی اور فنی خوبی سے باعث التفات بنے گا، منظومات کا حصہ بھی پسند خاطر ہوگا، ''کتابوں کی دنیا'' بھی پسند آئے گی اور ''بچوں کا زبان وادب'' بھی انہیں شادماں وکامراں بنائے گا۔

انہیں سطروں کے ساتھ ''ماہِ صیام مبارک'' کہتے ہوئے خداحافظ، خداناصر!

ابرار احمد خان

(ابرار احمد خان)

ڈاکٹر صابر علی سیوانی

HoNo-9-4-87/C/12, First Floor, Behind Moghal Residency Tolichowki,
Hyderabad -500009 (Mob.9989796088)

ذکرِ ساحرؔ

انسانی قدروں کا نقش گر: ساحرؔ لدھیانوی

پنجاب کی سرزمین نے ایک ایسے البیلے شاعر کو جنم دیا جس نے اپنے خلاقانہ ذہن کے نقش ہائے گراں مایہ کے ذریعہ اردو شعروسخن کی تاریخ میں اپنی انفرادی شناخت قائم کی ،لیکن اسے جب اپنے تخلص کے انتخاب کی ضرورت محسوس ہوئی تو اسے علامہ اقبالؔ کی شاعری کی جانب رجوع ہونا پڑا۔ جب وہ شاعر اقبالؔ کی نظم ''داغ'' پر پہنچا تو اسے اپنا تخلص مل گیا اور اس نے اقبالؔ کے اس شعر سے اپنا تخلص اخذ کیا۔

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی
سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحب اعجاز بھی

اقبالؔ کے اس شعر سے متاثر ہوکر عبدالحی نے اپنا تخلص ساحرؔ منتخب کیا۔

ساحرؔ لدھیانوی کی پیدائش ۸ مارچ ۱۹۲۱ء کو لدھیانہ میں ہوئی۔ والد کا نام فضل محمد اور والدہ کا نام سردار بیگم تھا۔فضل محمد کا تعلق ایک گوجر گھرانے سے تھا جو اس علاقے کا نہایت متمول اور زمیندار گھرانہ تھا۔ساحرؔ کی عمر ابھی محض آٹھ برس ہی تھی کہ اس کے والدین کے درمیان تلخیاں بڑھنے لگیں اور بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئے ،لیکن ساحرؔ اپنی والدہ کے حصے میں آئے ، عیش وآرام کی زندگی یکا یک مفلسی اور تنگ دستی میں تبدیل ہوگئی۔

ساحرؔ نے یہ سب دیکھا اور یہ ان کی نفسیات کا حصہ بن گیا۔ ساحرؔ کی والدہ نے ان کی پرورش و پرداخت نہایت مشکل حالات میں کی ،یہی وجہ ہے کہ سماج کی گھٹن اور عورت کی مجبوری و بے بسی کے جو مرقعے ساحرؔ کے یہاں پائے جاتے ہیں ،ایسی جذباتی شدت کے ساتھ ان کے کسی ہم عصر کے یہاں نہیں ملتے ہیں۔

ساحرؔ لدھیانوی کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری ان کی والدہ کے سر آ گئی تھی۔انہوں نے اپنے بیٹے کو خالصہ ہائی اسکول لدھیانہ میں داخلہ دلا دیا۔۱۹۳۷ء میں ساحرؔ نے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔اس کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج ،لدھیانہ میں داخلہ لیا،لیکن ۱۹۴۱ء میں انہیں کالج کی تعلیم ترک کرنی پڑی۔

ساحرؔ کو تعلیم ادھوری رہ جانے کا ملال تھا اس لیے انہوں نے پڑھائی جاری رکھنے کے لیے لاہور کے دیال سنگھ کالج میں اپنے نام کا اندراج کرایا۔ان کی کمیونسٹ پارٹی والی سرگرمیاں وہاں بھی جاری رہیں جس کی پاداش میں انہیں دیال سنگھ کالج سے بھی نکال دیا گیا۔

امرتا پریتم سے ساحرؔ کے معاشقے کے قصے جگ ظاہر ہیں انہوں نے زندگی بھر شادی نہیں کی اور امرتا کے پیار کے سہارے پوری زندگی گزار دی۔ سدھا ملہوترا سے بھی ان کی عشق کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں جو ایک اداکارہ اور گلوکارہ تھیں۔۵۹ سال کی عمر میں ساحرؔ کا بمبئی میں ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو انتقال ہوگیا۔

ساحرؔ لدھیانوی ذریعہ معاش کے سلسلے میں تقسیم ہند کے بعد دہلی آ گئے ،لیکن یہاں بات نہ بنی تو وہ ۱۹۴۹ء میں تلاش معاش میں بمبئی گئے۔ان کی اولین خواہش تھی کہ وہ فلموں کے گیت لکھیں۔ابتدائی دنوں میں انہیں سخت معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔طویل مدت تک بے روزگاری کی مار جھیلتے رہے ،لیکن ایک دن ان کی قسمت نے یاوری کی۔ان کے کالج کے زمانے کے دوست موہن سہگل نے ساحرؔ کو مشورہ دیا کہ وہ ایس۔ ڈی برمن سے ملاقات کریں۔ ان دنوں موسیقار ایس۔ڈی برمن کسی بہترین نغمہ نگار کی تلاش میں تھے۔ساحرؔ نے ان کی موسیقی کی دھنوں پر ایک شاندار نغمہ ''ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں'' ،فلم نور جہاں کے لئے لکھا۔ یہ فلم ۱۹۵۱ء میں ریلیز ہوئی ،لیکن ساحرؔ کی مقبولیت کو چار چاند اس وقت لگا جب انہوں نے فلم ''بازی'' کے لیے

نغمے لکھے جو ۱۹۵۱ میں ہی ریلیز ہوئی۔ برمن ان کی نغمہ نگاری سے بہت متاثر ہوئے۔ برمن سے ان کے تعلقات ۱۹۵۷ء تک قائم رہے، جب ان کی فلم ''پیاسا'' کے لیے نغمے لکھے اور یہ نغمے اتنے مقبول ہوئے کہ ''ٹائم میگزین'' نے اسے سو شاہکار فلموں میں سے ایک فلم قرار دیا تھا جس کی کامیابی میں ساحرؔ کے بہترین نغموں کا بھی اہم کردار شمار کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے بھی ساحرؔ کے نغموں کی ستائش کی تھی۔ اب ان کی شہرت فلم انڈسٹری کے علاوہ بر صغیر میں پھیل چکی تھی۔

ساحرؔ کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے فلم رائٹر ایسوسی ایشن کے ساتھ مل کہ یہ آواز بلند کی کہ وودھ بھارتی سے جو گیت نشر کئے جاتے ہیں ان میں نغمہ نگار کا نام بھی شامل کیا جائے اور گراموفون ریکارڈ پر بھی پیش کیا جائے، جس کے بعد آل انڈیا ریڈیو نے نغمہ نگار کے ناموں کا بھی ذکر کرنا شروع کر دیا اور یہ روایت آج بھی جاری ہے۔ ساحرؔ نے یہ بھی شرط رکھی تھی کہ انہیں میوزک ڈائرکٹر سے ایک روپیہ زیادہ نغمہ نگاری کے لئے رقم دی جائے اور ان کی یہ شرط بھی منظور کی گئی۔

ساحرؔ متعدد رسائل کے ایڈیٹر بھی ہے۔ ان میں ''ادب لطیف'' (لاہور) ''سویرا'' (لاہور) اور ''شاہراہ'' (دہلی) شامل ہیں۔ ساحرؔ کے شعری مجموعے ''تلخیاں'' (۱۹۴۴) ''پرچھائیاں'' (۱۹۵۵) ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' (۱۹۷۳) کے عنوانات پر مشتمل ہیں۔ علاوہ ازیں ''گاتا جائے بنجارہ'' کے عنوان سے بھی ان کا شعری مجموعہ پہلی دفعہ ۱۹۵۸ء، دوسری بار ۱۹۶۴ء اور تیسری مرتبہ ۱۹۷۴ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کے شعری مجموعوں کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے جس سے ان کے نغمات کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ساحرؔ کی نظموں پر مشتمل ایک مجموعہ ''بچے من کے سچے'' عنوان سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا جسے سرور شفیع نے ترتیب دیا تھا۔ مختصر افسانوں پر مشتمل ایک کتاب ''دھرتی کے آنسو'' کے عنوان سے ''جین بک ڈپو'' انار کلی لاہور سے شائع ہوئی جو ۲۰۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے سرورق پر ساحرؔ لدھیانوی اور حمید اختر قریشی کے نام چھپے ہیں، جس میں کرشن چندر، دیویندر ستیارتھی، احمد ندیم قاسمی، ابراہیم جلیس، راما نند ساگر، شفیق الرحمٰن وغیرہ کے افسانے شامل ہیں۔

ساحرؔ کو پدم شری کے اعزاز سے ۱۹۷۱ء میں نوازا گیا۔ پہلا فلم فیئر ایوارڈ ''تاج محل'' میں بہترین نغمہ نگار کے لیے دیا گیا۔ یہ ایوارڈ انہیں ۱۹۶۳ء میں ملا دوسرا فلم فلم فیئر ایوارڈ فلم ''کبھی کبھی'' کے لیے بہترین نغمہ نگار کے لیے ان کے حصے میں آیا۔ ۱۹۷۳ء میں انہیں اس ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ ۱۹۷۳ء میں ہی ساحرؔ کو سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ساحرؔ نے اپنے تیس سالہ فلمی کیرئر میں ایک سو گیارہ فلموں کے لیے ۷۱۸ نغمے تحریر کیے جو کامیاب نغمے قرار دیے جاتے ہیں۔

فلمی دنیا نے ساحرؔ کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ساحرؔ نے فلموں میں بالکل نئی طرح کے گیت لکھے، غزلیں لکھیں، بھجن لکھے، بچوں کے لیے گیت لکھے غرض انہوں نے بالکل اچھوتے انداز کی شاعری کی۔ ادبیت سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا اور نہ ہی اپنے اصولوں کو داؤ پر لگایا۔ غیر معمولی کامیابی اور بے پناہ شہرت حاصل کرنے والے ساحرؔ نے شہرت و مقبولیت کے ساتھ ساتھ بے پایاں دولت بھی حاصل کی۔ ان کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ انہوں نے فلمی گانوں پر ادبی چھاپ چھوڑی۔ ہندی کے الفاظ کا اتنی خوبصورتی کے ساتھ بہت کم شعرا کے یہاں ملتا ہے جتنی خوبصورتی سے ساحرؔ نے ان کا استعمال کیا ہے۔

ساحرؔ کے مجموعہ ''تنہائیاں'' کی مقبولیت اور ان کے شعری اختصاص کے حوالے سے جامع اردو ''انسائیکلو ہیڈیا'' مطبوعہ ۲۰۰۳ء کے صفحہ نمبر ۳۰۲ پر یہ تحریر ملتی ہے:

> ''تنہائیاں' ساحرؔ کی نظموں کا وہ مجموعہ ہے جو نوجوانوں میں بہت مقبول رہا کیوں کہ نوجوانوں کو اس میں اپنے دلوں کی دھڑکنیں ملیں۔ ایک بہتر اور خوشحال زندگی کے خواب ملے۔ اپنے فلمی گیتوں کے مجموعے 'گاتا جائے بنجارہ' کے دیباچہ میں ساحرؔ نے اس بات پر زور دیا کہ ان کی کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ فلمی گیتوں کو تخلیقی شاعری سے قریب لایا جائے تا کہ جدید سیاسی خیالات، جو انسان کی فلاح سے ہم آہنگ ہیں، عوام تک ان گیتوں کے ذریعے سے پہنچیں۔''

ساحرؔ کا فلمی گیتوں کو تخلیقی شاعری سے قریب لانے کا یہی جذبہ انہیں

دوسرے فلمی نغمہ نگاروں سے ممتاز بناتا ہے وہ گیتوں کے ذریعہ انسانی فلاح وترقی کی باتیں اور سیاسی خیالات کو انسانوں کی فلاح ہے ہم آہنگ کرنے کی وکالت کرتے ہیں۔

ساحر معاشرے میں سب سے خوبصورت اور قابل احترام شخصیت عورت کو قرار دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہورہے مظالم کو اپنے گیتوں کے ذریعہ نہایت مسحور کن انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ بچوں کی معصومیت اور ان کے من میں پائی جانے والی سچائی کو بیان کرتے ہیں۔ وہ دیش بھگتی اور وطن پرستی کی وکالت کرتے ہیں۔ وہ ثقافتی ومعاشرتی ثروت مندی کی خوبصورت تعبیر پیش کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے بھجن کے ذریعے خدا کی برتری اور بزرگی کی باتیں بھی کرتے ہیں حالاں کہ وہ خود خدا کے وجود کے قائل نہیں۔

ساحر اپنے گیتوں کو محض پیار محبت اور عشق و رومان پیش کرنے کا ذریعہ نہیں تصور کرتے بلکہ معاشرے میں موجود سماجی اور سیاسی برائیوں پر بھی کاری ضرب لگانے کا کام کرتے ہیں۔ وہ اپنے نغموں میں فارسی، مذہبی، ہندی، بھوجپوری الفاظ کا بھی بخوبی استعمال کرتے ہیں، لیکن تفہیم مطالب میں کوئی وقت پیش نہیں آتی ہے۔

ساحر لدھیانوی سماج میں موجودہ استحصالی نظام کی سخت لفظوں میں مذمت کرتے ہیں اور اس اونچ نیچ، ذات پات اور بھید بھاؤ کے نظام کو مٹا کر سماج میں نہ ہندو نہ مسلمان بلکہ انسان بننے کی اہمیت کو اجاگر کرتے اور گنگا کے پانی کو امرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ساحر کا اپنا مخصوص نظریہ اور ویژن ہے، تبھی تو وہ کہتے ہیں ؎

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم
کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوع سحر سے ہم
مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم

ساحر ایک انسان دوست فن کار تھے جو خلوص ان کے فن میں ہے وہی ان کی شخصیت میں بھی ملتا ہے۔ انہیں انسان اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے بیحد پیار تھا۔ ابتدا سے ہی ان کی ہمدردی سماج کے حاشیے پر پڑے ہوئے طبقات کے ساتھ رہی۔ وہ مظلوم انسانوں کے ساتھ ہمیشہ سے کھڑے رہے۔ محنت کش طبقے سے ساحر کی ہمدردی محض نظریاتی نہیں تھی بلکہ انہوں نے خود بھی شدید معاشی مشکلات کا سامنا کیا تھا۔ ساحر نے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جذبات کا اظہار نہ صرف اپنی شاعری میں کیا بلکہ انہوں نے عملی طور پر بھی اور سیاسی طور پر بھی اس نظام کے خلاف جدوجہد کی، کیفی اعظمی نے ساحر کی احتجاجی شاعری اور مظلوموں کے ساتھ ان کی وابستگی کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''نجی زندگی کی محرومیوں شکستوں اور الجھنوں نے ساحر کو اس قدر گھلایا، پگھلایا ہے کہ اب ان میں احساس ہی احساس باقی رہ گیا ہے، جس کے تار کسی مدھم سے تحرک سے جھنجھنا اٹھتے ہیں اور ان کا رواں رواں ہر بے انصافی کے خلاف احتجاج کرنے لگتا ہے۔'' (مضمون ساحر اور اس کی شاعری، مرتبہ پرکاش پنڈت ص ۱۶)

فاقہ کشوں غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کے بعد ساحر کی ہمدردیوں کا محور ہندوستانی عورت رہی ہے۔ وہ ہندوستانی معاشرے میں عورتوں کی زبوں حالی اور مظلومیت سے شدید متاثر دکھائی دیتے ہیں اور اپنی تخلیقات میں ان احساسات کا نہایت جرأت مندی کے ساتھ اظہار کرتے ہیں۔ انسان اور انسانیت کے خون پر اپنی احتجاجی آواز بلند کرتے ہیں، قتل و غارت گری پر سوال کھڑے کرتے ہیں۔ زمین کی خاطر زمین پر جنگ کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہیں۔ ساحر اپنی نظم ''خدائے برتر تری زمیں پر'' میں مختلف طرح کے معاشرتی مسائل اور خصوصاً ماؤں اور بہنوں کی ناقدری اور ان کے خلاف روا ظلم کو ختم کرنے کی دعا کرتے ہیں اور یہ سوال بار بار سامنے لاتے ہیں کہ خدا کی زمین پر یہ جنگ کیوں ہے ؎

خدائے برتر تری زمیں پر زمیں کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے؟
ہر ایک فتح وظفر کے دامن پہ خون انسان کا رنگ کیوں ہے؟

زمیں بھی تیری ہے ہم بھی تیرے یہ ملکیت کا سوال کیوں ہے؟
یہ قتل وخوں کا رواج کیوں ہے یہ رسم جنگ وجدال کیوں ہے؟

جنہیں طلب ہے جہان بھر کی انہیں کا دل اتنا تنگ کیوں ہے؟
خدائے برتر تری زمیں پر زمیں کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے؟
غریب ماؤں شریف بہنوں کو امن وعزت کی زندگی دے
جنہیں عطا کی ہے تو نے طاقت انہیں ہدایت کی روشنی دے
سروں میں کبر وغرور کیوں ہے دلوں کے شیشے پہ زنگ کیوں ہے؟
خدائے برتر تری زمیں پر زمیں کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے؟

ساحؔر کی شاعری کی خصوصیات اور ان کی زبان کے حوالے سے ناز صدیقی نے بہت متوازن رائے قائم کی ہے۔ ساحؔر نے اپنی شاعری میں ہندی، فارسی اور اردو کے امتزاج سے جو نگارخانہ تعمیر کیا ہے، اس کے متعلق نازؔ صدیقی لکھتی ہیں:

''ان کی شاعری مرصع سازی ہے جس میں الفاظ نگینوں کی طرح جڑے نظر آتے ہیں ۔ وہ الفاظ کا انتخاب نہایت موزونیت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں کہیں بھرتی کے یا غیر موزوں الفاظ نہیں ملتے نہ ہی ناروا تعقید ملتی ہے۔ ان کے مصرعے اور اشعار خوبصورتی کے ساتھ ترشے ترشائے اور ڈھلے ڈھلائے ہوتے ہیں۔ ساحؔر کی لفظیات میں عام طور پر فارسی اور ہندی الفاظ کا متوازن امتزاج ملتا ہے۔ بعض نظموں میں ہندی لفظیات اور بعض میں فارسی فرہنگ کی کثرت ان کے نظموں کے جذباتی ماحول اور مجموعی فضا سے مطابقت رکھتی ہے...... ساحؔر کی شاعری کے مطالعہ کے بعد ان کی شاعری کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ کہ انہوں نے غزل اور نظم کے لئے علیحدہ علائم استعمال کئے ہیں۔ ساحؔر نے غزل میں نئے علائم استعمال کئے ہیں اور روزمرہ کے الفاظ کو نئے مطالب اور معانی عطا کئے۔'' (ساحؔر شخص اور شاعر، نازؔ صدیقی، پنجابی پستک بھنڈار، دریبہ کلاں، دہلی ۱۹۶۸ء ص ۱۶۶)

ساحؔر نے انسانی رشتے کی نزاکتوں کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے، بچوں اور عورتوں اور استحصال زدہ لوگوں کی نفسیات کو بڑی مہارت کے ساتھ اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ اگر بچوں کی ذہنیت اور نفسیات کی بات کی جائے تو ان میں کسی طرح کی مصلحت کوشی نظر نہیں آتی ہے۔ وہ ہر بات ایمان داری سے بیان کر دیتے ہیں وہ من کے سچے ہوتے ہیں ان میں کسی طرح کا چھل کپٹ اور کینہ ریاکاری نہیں ہوتی ہیں۔ ان کا من گنگا جل کی طرح صاف ہوتا ہے۔ ساحؔر نے بچوں کی نفسیات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اُس نظم میں پیش کیا ہے جو ہے تو ایک فلمی گیت، لیکن انسانیت کا ایسا درس اس میں موجود ہے کوئی بھی لیڈر یا مذہبی رہنما اس انداز سے پیش کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ اس نظم کا یہ حصہ دیکھئے:

بچے من کے سچے سارے جگ کی آنکھ کے تارے
یہ وہ ننھے پھول ہیں جو بھگوان کو لگتے پیارے
انسان جب تک بچہ ہے تب تک سمجھو سچا ہے
جوں جوں اس کی عمر بڑھے، من پر جھوٹ کا میل چڑھے
کرودھ بڑھے نفرت گھیرے لالچ کی عادت گھیرے
بچپن ان پاپوں سے ہٹ کر اپنی عمر گزارے
تن کومل من سندر ہیں بچے بڑوں سے بہتر ہیں
ان میں چھوت اور چھات نہیں جھوٹی ذات اور پات نہیں
بھاشا کی تکرار نہیں مذہب کی دیوار نہیں
ان کی نظر میں اک ہیں مندر، مسجد گردوارا

بچوں کے حوالے سے ساحؔر کی ایک دوسری شعری تخلیق بھی کافی شہرت کی حامل ہے جس میں وہ بچے کو ہندو مسلمان بننے کے بجائے انسان بننے کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔

تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

ترقی پسند شعرا میں ساحؔر نے عورتوں کے ساتھ ہو رہے مظالم اور ان کے استحصال کے خلاف سب سے بڑھ چڑھ کر آواز بلند کی ہے۔ عورتوں کو سر بازار نیلام کئے جانے اور ان کی عزت و آبرو کا سودا کئے جانے کے خلاف انہوں نے اپنی نظموں میں دھار دار لفظوں کا ستعمال کیا ہے۔ ان کی ایک نظم کا عنوان ہی ''چکلے'' ہے جہاں عورتوں کے جسموں کا سودا ہوتا ہے۔ یہی وہ عورتیں ہیں جنہوں نے مردوں کو جنم دیا، لیکن مردوں نے انہیں بازار دیا۔ ان کی عزت کا سودا کیا۔ اس قبیح روش پر انہوں نے جتنی

شدت سے آواز اٹھائی ہے، اس کی مثال ترقی پسند شعرا کے ہاں کم ملتی ہے ''چکلے''،نظم کا یہ حصہ دیکھیں۔

یہ کو چے یہ نیلام گھر دلکشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ کہاں ہیں ؟
ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں؟
یہ بھوکی نگاہیں حسینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں؟

ساحؔر نے ایک اور نظم میں بھی عورت کی بے بسی اور لاچاری کو بیان کیا ہے کہ اس کے ساتھ کھلواڑ کیا جاتا ہے اور کھلواڑ کرنے والے مرد ہی ہوتے ہیں جن کو عورت نے جنم دیا ہے ۔

عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا جب جی چاہا دھتکار دیا
تلتی ہے کہیں دیناروں میں بکتی ہے کہیں بازاروں میں
ننگی نچوائی جاتی ہے عیاشوں کے درباروں میں
یہ وہ بے عزت چیز ہے جو بٹ جاتی ہے عزت داروں میں
عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا

فلسفہ وقت ترقی پسند شعرا کے یہاں نہایت شدومد کے ساتھ پایا جاتا ہے خصوصاً اقبالؔ کی شاعری میں وقت کی ساحری اور وقت کی اہمیت کا ذکر اکثر و بیشتر مقام پر دیکھا جا سکتا ہے،لیکن ساحؔر نے ''وقت'' کے فلسفے کو جتنی عمدگی سے بیان کیا ہے اس سے وقت کی اثر انگیزی کا گراف کافی اونچا دکھائی دیتا ہے۔ ساحؔر نے زندگی کے لیے نہایت اہم چیز وقت کی اہمیت کو بیان کرنے کے لئے جن لفظوں کا انتخاب کیا ہے، وہ قابل داد ہے۔جس زاویۂ نگاہ سے ساحؔر نے وقت کو دیکھا ہے، محسوس کیا ہے وہ اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس نظریے میں معاصر فکر کے تقاضے دکھائی دیتے ہیں۔ عصری حسیت کے عناصر نظر آتے ہیں اور موجودہ وقت میں وقت کی اہمیت سے روگردانی کا جو چلن پایا جاتا ہے اس کی سچی اور بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ وقت کو ساحؔر نے کس نظریے سے دیکھا ہے اسے محسوس کرنے کے لیے ان کی شاہکار نظم کے چند بند پر نظر ڈالی جاسکتی ہے ۔

وقت سے دن اور رات وقت سے کل اور آج
وقت کی ہر شے غلام وقت کا ہر شے پہ راج
وقت کی گردش سے ہے چاند تاروں کا نظام
وقت کی ٹھوکر میں ہیں کیا حکومت کیا سماج
وقت کی پابند ہیں آتی جاتی نعمتیں
وقت ہے پھولوں کی سیج وقت ہے کانٹوں کا تاج
آدمی کو چاہئے وقت سے ڈر کر رہے
کون جانے کس گھڑی وقت کا بدلے مزاج

یہ وقت ہی ہے جو گھڑی بھر میں بادشاہوں کے سر سے تاج چھین لیتا ہے اور پل بھر میں ایک عام انسان کو بادشاہ وقت بنا دیتا ہے، اس لیے ہمیشہ وقت سے ڈر کر رہنا چاہئے۔

ساحؔر نے فلموں کے گیتوں کے ذریعے سیاسی سماجی اور آپسی بھائی چارے کا سبق دینے کا کام کیا۔ ان کے بارے میں جاں نثار اختر کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ ساحؔر نے اپنے گیتوں کے ذریعہ صرف عشق و محبت کے راگ نہیں الاپے بلکہ سماجی آئینہ بھی پیش کیا:

> ''ساحؔر کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے فلموں کو ایسے گیت دیئے جو سیاسی اور سماجی شعور سے لبریز ہیں۔ یہ ایک بڑا اقدام ہے، جو ساحؔر نے بڑی دلیری سے اٹھایا اور دوسرے شاعروں کی طرح فلم دنیا کی گندگی میں ڈوب کر نہیں رہ گیا بلکہ اس نے اپنے قلم کی قوت سے فلمی گیتوں کو اگر ایک طرف حسن کی لطافت ،نزاکت اور عشق کا درد و کسک بخشا تو دوسری طرف سماجی ، مادی اقتصادی شعور دیا۔ اس نے خود کو دھوکہ دیا نہ اپنے فن کو، نہ ترقی پسند تحریک کو نہ عوام کو......اس نے وہ کیا جو بحیثیت ایک بیدار شاعر اس کا فرض تھا۔''

ساحؔر نے جذبات واحساسات کو قابو میں رکھتے ہوئے نغمے لکھے اور ان نغموں میں کہیں بھی فحش الفاظ یا عریانیت و بے پردگی کو بڑھاوا دینے

والے الفاظ کا سہارا نہیں لیا، ساحؔر نے زندگی کی تلخیوں کو اپنے گیتوں میں بڑی ہنر مندی سے سمونے کی کوشش کی ہے۔ کچھ فلمی نغمے تو ان کی زندگی کی تفسیر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ حیات و کائنات سے مطمئن نہیں بلکہ ماحول کی ناخوشگواری کے شاکی ہیں۔

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

ساحؔر کو دنیا نے تجربات و حوادث سے بھری زندگی بخشی تھی اور وہ پوری زندگی اس زندگی کی تفسیر بیان کرتے رہے۔ ان کا مشہور زمانہ شعر جوان کی زندگی سے عبارت ہے، وہ یہ کہ:

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

یا ان کا یہ شعر جس میں انہوں نے اپنے گیتوں کو زندگی کے کرب کی عکاسی قرار دیا ہے۔

اشکوں میں جو پایا ہے وہ گیتوں میں دیا ہے
اس پر بھی سنا ہے کہ زمانے کو گلہ ہے

یا ساحؔر کے یہ اشعار جن میں غم والم اور حسرت و یاس کا لامتناہی سلسلہ دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ اشعار ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہم غمزدہ ہیں لائیں کہاں سے خوشی کی بات
دیں گے وہی جو پائیں گے اس زندگی سے ہم

کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

غم اور خوشی میں فرق نہ محسوس ہو جہاں
میں دل کو اس مقام پر لاتا چلا گیا

تری دنیا میں جینے سے تو بہتر ہے کہ مر جائیں
وہی آنسو وہی آہیں وہی غم ہے جدھر جائیں

ہو کر خراب مئے ترے غم کو بھلا دیے
لیکن غم حیات کا درماں نہ کر سکے

نظم ''دیکھا ہے زندگی کو'' میں ساحؔر نے زندگی میں پیش آئے حوادث اور لوگوں کے چہروں پر پڑے نقاب کی منظر کشی کی ہے۔

دیکھا ہے زندگی کو کچھ اتنے قریب سے
چہرے تمام لگنے لگے ہیں عجیب سے

ساحؔر کی شاعری میں رجائیت کے عناصر بھرے پڑے ہیں۔ وہ زندگی سے دکھی ضرور ہیں، لیکن ناامید نہیں۔

میں زندگی کا ساتھ نبھاتا چلا گیا
ہر فکر کو دھوئیں میں اڑاتا چلاگیا

ہزار برق گرے لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں

کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوع سحر سے ہم

غم روزگار، خودداری، دل شکنی کے علاوہ زندگی کے متعدد مسائل کا ذکر ساحؔر کے فلمی نغموں میں موجود ہے۔ یہ نغمے ان کی انفرادی شان لیے ہوئے ہیں اور طرح طرح سے انسانیت اور زندگی کے نازک رشتوں کے تحفظ کی باتیں کرتے ہیں۔

میں اور تم سے ترک محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غم روزگار نے

خود داریوں کے خون کو ارزاں نہ کر سکے
ہم اپنے جوہروں کو نمایا ں نہ کر سکے

ٹوٹا طلسم عہد محبت کچھ اس طرح
پھر زندگی کی شمع فروزاں نہ کر سکے

اپنے تجربات زندگی کو فلمی نغموں کا جامہ پہنانے والے اس شاعر نے فلمی نغمے تو ضرور لکھے، لیکن ادبیت سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ فلم انڈسٹری کو ساحؔر نے ایک نیا ماحول دیا۔ ایک نیا ذوق بخشا، ایک نئی فلمی زمین دی۔ ایک نئی فکر دی اور نغمہ نگاروں کے لیے آگے کی راہ ہموار کی۔ ان کی وجہ سے ان کے بعد کے نغمہ نگاروں کو بھی حوصلہ ملا۔ ان کے نام موسیقاروں کے

ساتھ ساتھ فلم اسکرین کا حصہ بننے لگے۔ ساؔحر کی زندگی جن آزمائشوں اور جدوجہد سے عبارت ہے اس کے باعث ان کی شاعری میں تلخیاں، اداسیاں نظر آتی ہیں۔ ادیب وشاعر احمد راہی نے ساؔحر کی شاعری میں تلخی کے وجود کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ساؔحر کی شاعری میں بے حد تلخی ہے۔ یہ تلخی اس سنگدل سماج اس استحصال معاشرہ کے خلاف ہے، جس نے اس کو باپ کی زندگی میں بھی یتیم بنائے رکھا۔ اس کو اپنے باپ کی زمینوں سے تو حصہ ملا وہ بھی مقدمہ بازی کے ذریعہ، مگر اسے باپ کی شفقت نصیب نہ ہوئی۔ ایک تو ساؔحر بے حد جذباتی تھا دوسرے اس کے لہو کی ایک ایک بوند میں رچی ہوئی تلخی نے اردو شاعری کو ایک ایسا شاعر دیا جس کی مثال نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد اب تک کہیں ملتی ہے۔ فلمی شاعر کے طور پر بھی وہ اپنے ہر گیت میں اپنے آدرش کا برملا پرچار کرتا رہا۔'' (مضمون اک دیا اور بجھا'' احمد راہی مشمولہ کلیات ساؔحر، الحسنات بکس پرائیوٹ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۰۱۴، ص ۱۰)

یہ ایک حقیقت ہے اور اسے باربار دہرایا بھی جاتا رہا ہے کہ ساؔحر کی زندگی میں پائی جانے والی تلخی ان کی شاعری پر منعکس ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں ان کی زندگی کے تجربات اور نشیب وفراز نے بھی ان کی شاعری میں کڑواہٹ گھول دی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ زندگی سے نالاں دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی کے اُتار چڑھاؤ کے متعدد رنگ ان کی شاعری کا حصہ بنے ہیں۔ ان رنگوں میں کچھ رنگ یہاں ملاحظہ کیجئے ؎

اس طرح زندگی نے دیا ہے ہمارا ساتھ
جیسے کوئی نباہ رہا ہو رقیب سے

ابھی زندہ ہوں، لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنا کے سہارے جی لیا میں نے

تنگ آچکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

اللہ رے فریب مشیت کہ آج تک
دنیا کے ظلم سہتے رہے خامشی سے ہم

ساؔحر نے اگرچہ ایک طرف زندگی سے تنگ آجانے، رقیب سے نباہ کیے جانے، خاموشی سے دنیا کے ظلم سہتے رہنے کی بات کہی ہے، لیکن دوسری جانب وہ زندگی کو بامقصد بنانے اور اسے دوسروں کے لیے وقف کر دینے کو ہی زندگی کا مقصد بتاتے ہیں ؎

کیا خاک وہ جینا ہے جو اپنے ہی لیے ہو
خود مٹ کے کسی اور کو مٹنے سے بچا لے

موجودہ سیاست اور سیاسی روش کو بھی انہوں نے ہدف تنقید بنایا ہے اور یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ؎

بہت دنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا
کہ جب جوان ہوں بچے تو قتل ہو جائیں

موجودہ تہذیب کی رفوگری کرتے ہوئے ساؔحر نے نہایت طنزیہ انداز اپنایا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس میں قبا ہی نہیں ہے۔ قبا دراصل ایک قسم کا کھلا ہوا لمبا کوٹ ہوتا ہے جس میں کبھی کبھی بند قبا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساؔحر موجودہ تہذیبی روش کو یوں پیش کرتے ہیں ؎

ہمارے عہد کی تہذیب میں قبا ہی نہیں
اگر قبا ہو تو بند قبا کی بات کریں

ساؔحر نے اپنی تخلیقات کو گوناگوں رنگوں سے سجایا ہے۔ ان کے نغمات و اشعار ایک ایسے نگار خانے کی مانند ہیں جس میں ہر طرح کے معاشرتی ثقافتی، ملکی، بین الاقوامی اور سیاسی مسائل وموضوعات ملتے ہیں۔ وہ دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنا ایک مخصوص نظریہ پیش کرتے ہیں۔

ساؔحر کی شاعری میں کہیں ابہام نہیں، کہیں الجھاؤ نہیں۔ لفظوں کی سلاست اور روانی سے آراستہ ساؔحر کی شاعری عوام وخواص کی توجہ کا مرکز بنی۔ آج بھی ان کے نغمے گائے، گنگنائے اور سنے جاتے ہیں۔ فلموں میں ان کے نغمے جو بہترین موسیقی سے آراستہ کیے گئے ہیں انہیں سن کر انسان جھوم اٹھتا ہے، اس کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ یہی اس شاعر کی بڑی کامیابی ہے۔

❁❁❁

فخرالدین عارفی

Mohammadpur, Shahganj, Patna - 800006 (Mob. 6201527160)

وادیٔ عشق کا شاعر: ساحر لدھیانوی

دل اگر زندہ ہو اور اس میں پیار کا پودا پھل پھول رہا ہو تو آپ یقین کریں کہ آپ کے وجود کا تاج محل کبھی کھنڈر میں تبدیل نہیں ہوسکتا ہے، جب جب کسی کی یادوں اور وعدوں کا چاند، چودھویں کے چاند کی صورت، آپ کے دل کے آسمان پر جگمگائے گا، آپ کے پیار اور انتظار کے تاج محل کی ایک ایک اینٹ سنگ مرمر کی مانند چمک اور دمک اٹھے گی اور اس کی چمک اور دمک سے آپ کے اُداس اور مرجھائے ہوئے رخسار کا گلاب ایک مرتبہ پھر یوں کھل اٹھے گا، جیسے کوئی کلی ابھی ابھی اپنی دوشیزگی کا پیراہن تبدیل کر کے ہواؤں کی بانہوں سے لپٹ کر سوگئی ہو اور اُس کی خوشبو ہر سمت بکھر بکھر گئی ہو۔

پیار انسان کو ایک ایسے سرور و کیف سے آشنا کرتا ہے جس کی کوئی دوسری نظیر کہیں اور نہیں ملتی ہے، کوئی طاقت ہر پل آپ کے ساتھ ساتھ موجود رہتی ہے جو زندگی کی سخت دھوپ میں بادل بن کر آپ کو وقت اور حالات کی تیز گرمی سے نجات دینے کا کام کرتی ہے، جو کبھی شبنم کی بوند بن جاتی ہے اور کبھی بارش کی ہلکی ہلکی پھوار۔ محبوب لاکھ سنگ دل ہو، بے وفا ہو، ہرجائی ہو اور ستم گر بھی ہو، پھر بھی اُس کی آنکھوں کا چراغ زندگی کی تاریک راہوں کو منور کرتا رہتا ہے، بقول بشیر بدر ؎

مرے راستے میں اُجالا رہا
دیئے اُس کی آنکھوں کے جلتے رہے

محبوب کی یادیں کبھی عاشق کے دل سے ختم نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ زندگی کے سفر میں ہر مقام پر پرچھائیاں بن کر تعاقب کرتی ہیں، یہ تصورات کی پرچھائیاں ہی ہمیں جینے کا حوصلہ دیتی ہیں اور آنسوؤں کو موتیوں میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ ساحر لدھیانوی کا ایک خوب صورت شعر ہے ؎

تم چلی جاؤ گی، پرچھائیاں رہ جائیں گی
کچھ نہ کچھ حسن کی رعنائیاں رہ جائیں گی

اِس زمین میں ساحر کی پوری غزل بہت پیاری اور خوبصورت ہے جو ساحر کی زندگی کے درد اور غم کا قصہ بیان کرتی ہے۔ اس غزل کے ایک ایک شعر میں ساحر کے دل کا درد بے چینی کی کروٹ لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہماری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں ؎

یاد مٹتی ہے نہ منظر کوئی مٹ سکتا ہے
دور جا کر بھی تم اپنے کو یہیں پاؤ گی

گھل کے رہ جائے گی جھونکوں میں بدن کی خوشبو
زلف کا عکس گھٹاؤں میں رہے گا صدیوں

تم کہ اس جھیل کے ساحل پہ ملی ہو مجھ کو
جب بھی دیکھوں گا یہیں مجھ کو نظر آؤ گی

کہا جاتا ہے کہ امرتا پریتم ساحر سے بہت پیار کرتی تھیں خود ساحر بھی امرتا پریتم کی سانسوں میں اپنے دل کی دھڑکن کا احساس کرتے تھے۔ امرتا پریتم نے ساحر کے تعلق سے ایک جگہ لکھا ہے کہ: ''میرے پاس ایک چیز تھی جو سنبھال سنبھال کر رکھا کرتی تھی۔ یہ ساحر کی نظم 'تاج محل' تھی جو اس نے فریم کروا کر مجھے دی تھی۔ ایک دفعہ ایک مشاعرے میں لوگ ساحر سے آٹوگراف لے رہے تھے، میں نے ہنس کر اپنے ہاتھ کی ہتھیلی اُس کے آگے کر دی اور کہا: آٹوگراف۔ ساحر نے ہاتھ میں پکڑے پین کی سیاہی اپنے انگوٹھے پر لگا کر اپنا انگوٹھا میری ہتھیلی پر لگا دیا، جیسے میری ہتھیلی کے کاغذ پر اپنے دستخط ثبت کر دیئے ہوں۔ میری زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں اپنے ہر خیال میں، ہر تخیل میں ساحر کا جادو چڑھتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔ اخباروں اور کتابوں میں پڑھا کرتی تھی کہ ایک ہونے والی ماں کے کمرے میں جس طرح کی تصویر ہوتی ہے اور اپنے دل میں وہ جو تصویر بساتی ہے، اس کے بچے کے

خدوخال ویسے ہی سانچے میں ڈھلنے لگتے ہیں اور میرے تخیل نے جیسے دنیا کی نظروں سے چھپ کر دبے لہجے میں میرے کانوں میں کہا: اگر میں ساحرؔ کا چہرہ ہروقت اپنی یادوں کے سامنے رکھوں تو میرے بچے کی صورت اس کے مشابہ ہوجائے گی...... اور جب ۳/جولائی ۱۹۴۷ء کو میں ماں بنی اور میں نے پہلی مرتبہ اس کا منھ دیکھا تو یہ خیال دل میں نشوونما پاتا رہا کہ اس کی صورت ساحرؔ سے مشابہ ہے، پھر برسوں بیت گئے، میرے بیٹے کی عمر قریب تیرہ سال ہوچکی تھی، انہی دنوں میں ایک روز نوراج نے مجھ سے سوال کیا:

''ماں! ایک بات پوچھوں، سچ سچ بتاؤ گی؟''

''ہاں'' میں نے کہا۔

''کیا میں ساحرؔ انکل کا بیٹا ہوں؟''

''نہیں......!''

''اگر ہوں تو بتا دیجئے! مجھے ساحرؔ انکل اچھے لگتے ہیں۔''

''ہاں بیٹے مجھے بھی وہ اچھے لگتے ہیں، لیکن اگر یہ سچ ہوتا تو میں تم کو ضرور بتا دیتی۔''

سچ کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے، میرے بچے کو یقین آ گیا۔

۱۹۶۰ء میں جب میں بمبئی گئی تو ایک شام بیدی نے اچانک مجھ سے پوچھا: ''پرکاش پنڈت سے ایک بات سنی تھی کہ نوراج ساحرؔ کا بیٹا ہے۔'' اُس شام، میں نے بیدی صاحب کو اپنے عالم دیوانگی کی پوری کہانی سنائی اور ان سے کہا تھا: ''یہ میرے تخیل کا سچ ہے۔ حقیقت کا سچ نہیں''۔

تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح

ساحرؔ کی زندگی میں شاید کوئی غم ایسا ضرور تھا جس کو وہ خواہش کے باوجود فراموش کرنا نہیں چاہتے تھے، کسی کی یادوں کو اپنے سینے سے لگا کر جینے میں اُن کو بہت مزہ آتا تھا، وہ ساری ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے رہتے، کسی کی یادوں کی چتا میں سلگتے رہتے، لیکن اپنے محبوب کے خلاف شکوہ کا ایک لفظ بھی اپنی زبان پر لانا وہ توہین محبت تصور کرتے اور ایسا کرنے سے گریز کیا کرتے تھے۔ اپنی ایک نظم ''مضمحل خواب'' میں وہ اپنے جذبات واحساسات کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتادے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

پیار پر بس تو نہیں ہے مرا لیکن پھر بھی
تو بتادے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں
تو نے خود اپنے تبسم سے جگایا ہے جنہیں
ان تمناؤں کا اظہار کروں یا نہ کروں

تو کسی اور کے دامن کی کلی ہے لیکن
میری راتیں تری خوشبو سے بسی رہتی ہیں
تو کہیں بھی ہو، ترے پھول سے عارض کی قسم
تری پلکیں مری آنکھوں پہ جھکی رہتی ہیں

ساحرؔ لدھیانوی کی پوری شاعری خواہ وہ ادبی ہو یا فلمی ہمارے دل میں بہت اندر تک اتر جاتی ہے اور اُس کے مطالعے سے ہم اپنے وجود کے سناٹے میں محبت کے قدموں کی چاپ صاف سن سکتے ہیں ؎

یہ وادیاں، یہ فضائیں بلا رہی ہیں تمہیں
خموشیوں کی صدائیں بلا رہی ہیں تمہیں
ترس رہے ہیں جواں پھول ہونٹ چھونے کو
مچل مچل کے ہوائیں بلا رہی ہیں تمہیں

ساحرؔ لدھیانوی سگریٹ بہت زیادہ پیتے تھے، چپ چاپ سگریٹ پیتے رہنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ ہمیشہ آدھا سگریٹ پی کر بجھا دیتے اور پھر نیا سگریٹ سلگا لیتے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ساحرؔ کے چلے جانے کے بعد اس کے چھوڑے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کو ایک خوب صورت لڑکی بہت سلیقے سے ایک جگہ جمع کرتی تھی اور پھر اُن کو جلا کر اپنے ہونٹوں سے لگاتی تھی، یہ لڑکی کوئی اور نہیں امرتا پریتم تھی۔ امرتا پریتم نے اپنے مضمون ''تصورات کی پرچھائیاں'' میں ایک جگہ لکھا ہے:

''دیوانگی کی آخری چوٹی پر پاؤں رکھ کر ہمیشہ کھڑے نہیں رہا جا سکتا، اس لئے میں بھی بعد کے دنوں میں اپنی

دیوانگی کو ایک قصہ، کہانی اور افسانہ تصور کرنے لگی اور
مجنوں کے لیلیٰ لیلیٰ پکارنے والی حالت اور کیفیت سے
خود کو آزاد کرانے کی شعوری کوشش میں لگ گئی۔''

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کاغذ خالی دکھائی دیتا ہے، لیکن خدا جانتا ہے کہ وہ سادہ اور خالی نہیں ہوتا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں مجھے اکادمی کا ایوارڈ ملا، فون پر خبر سنتے ہی میں سر سے پاؤں تک تاپ میں جھلس گئی۔ اُس روز شام کے وقت ایک پریس نے اپنا رپورٹر میرے پاس بھیجا، اس کے ساتھ فوٹو گرافر بھی تھا، جب وہ تصویر لینے لگا تو وہ اس لمحے کو قید کرنا چاہتا تھا جو لمحہ کسی نظم کی تخلیق کے وقت کا لمحہ ہوتا ہے۔ میں نے کاغذ اور قلم میز پر رکھا اور ہاتھ میں قلم پکڑ کر بیٹھ گئی، لیکن نظم لکھنے کے بجائے بے خودی کے عالم میں، اُس کا نام لکھنے لگ گئی:

''ساحر......ساحر......ساحر......

سارا کاغذ بھر گیا، پریس کے لوگ چلے گئے تب میں بے
ہوشی سے لوٹی......خیال آیا صبح کو اخبار میں میری تصویر
شائع ہوگی تو میز کے کاغذ پر ساحر، ساحر کی گردان بھی
ہوگی، لیکن شاید کیمرے کا فوکس میرے ہاتھ کے اوپر
تھا، کاغذ پر نہیں، اس لئے دوسرے دن کے اخبار میں
کاغذ پر کچھ نہیں پڑھا جاسکتا تھا، کاغذ بالکل خالی دکھائی
دے رہا تھا، لیکن خدا جانتا ہے کہ وہ خالی نہیں تھا''۔

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو، زہر یہ بھی پی لیا میں نے
اُنہیں اپنا نہیں سکتا، مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھوکر جی لیا میں نے

محبت میں ناکامی اور محرومی انسان کا مقدر ہوتا ہے اور وصل کی آرزو میں اُس کو صرف فصل اور دوری کی سوغات ملتی ہے، پھر بھی ہجر و فراق کی یہ سوغات عاشق کے لئے بہت قیمتی اور نایاب ہوتی ہے اور فراق کے لحات میں عاشق کے دل سے رات کے پچھلے پہر جو آہ نکلتی ہے وہ بہر صورت معشوق کے گوش احساس سے ٹکراتی ہے اور اپنی بے بسی کی مکمل داستان بیان کرتی ہے۔

مجھے تمہاری جدائی کا کوئی رنج نہیں
مرے خیال کی دنیا میں مرے پاس ہو تم

میں اپنی روح کی ہر اک خوشی مٹالوں گا
مگر تمہاری مسرت مٹا نہیں سکتا

مرا تو کچھ بھی نہیں ہے، میں رو کے جی لوں گا
مگر خدا کے لئے تم اسیر غم نہ رہو

عاشق کسی بھی حال میں اپنے معشوق کو اُداس دیکھنا نہیں چاہتا ہے ساحرؔ بھی کسی کو اُداس دیکھ کر بے چین ہو جاتے ہیں۔

یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو
اُداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو

ساحرؔ کی زندگی میں محبت کے مختلف موڑ آئے، انہوں نے امرتا پریتم کا بے لوث پیار بھی دیکھا اور کسی کی بے وفائی سے بھی وہ دو چار ہوئے، لیکن اپنی خوشی کے لئے کسی بھی قیمت پر محبوب کی خوشی کو قربان کر دینا انہوں نے گوارا نہیں کیا۔ انگاروں پر خود چلتے رہے اور محبوب کی راہوں میں پھول نچھاور کرتے رہے اور کہتے رہے۔

جائیں تو جائیں کہاں
سمجھے گا کون یہاں، درد بھرے دل کی زباں
جائیں تو جائیں کہاں

ساحرؔ لدھیانوی نے متعدد خوبصورت نظمیں تحریر کی ہیں۔ ان کی نظموں میں ''خوبصورت موڑ'' ایک ایسی لازوال اور شاہکار نظم ہے جو پیار اور ایثار کی ایک خوب صورت مثال بن کر سامنے آتی ہے۔ یہ نظم ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کا درد بہت شدت کے ساتھ بیان کرتی ہے، اس نظم میں ساحرؔ لدھیانوی نے نہ صرف یہ کہ اپنے محبوب کی بے وفائی اور حالات کی تلخیوں کی جانب اشارہ کیا ہے بلکہ شاعر نے خود اپنی ذاتی زندگی کی کمزوریوں اور خامیوں کو بھی بالکل کھول کر پیش کر دیا ہے۔ ساحرؔ کی اس نظم میں جذبات واحساسات کا ایک وسیع دریا موجود ہے جس کی موجیں حالات کے پتھروں سے بار بار اپنا سر ٹکراتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

محبت میں ناکامی اور جدائی تو ہر سچے عاشق کا مقدر ہوتا

ہے،لیکن محبت کا پھول پھر بھی کھلتا ہے اور کانٹوں کے درمیان مسکراتا ہے۔محبت کا ایک گلاب ساؔحر کے دل میں بھی کھلا تھا،اس کی خوشبوان کو اتنی بھلی محسوس ہوئی کہ پھر کسی دوسرے پھول اوراس کی خوشبو کی جانب ان کا دھیان ہی نہیں گیا۔اپنی تمام زندگی کسی کی یادوں کے لئے وقف کردی،تمام عمر تنہا رہے،مگر پیار اور اقرار کے بندھن کوتوڑ کر شادی کے بندھن میں بندھنا گوارا نہیں کیا۔پیار اگر سچا ہوتو محبوب کی بے وفائی میں بھی مزہ آتا ہے،انگارے بھی پھول بن جاتے ہیں،محبوب جفا کی انتہا کردے،کوئی بات نہیں،آپ اپنی وفا کے چراغ کی لوکو کچھ اور تیز کردیں۔ وہ نفرت کرے آپ اس کا جواب محبت اور صرف محبت سے دیں،یہی محبت کی روایت رہی ہے ؎

مری بربادیوں کی داستاں ان تک پہنچ جائے
سوا اس کی محبت کے خدا سے اور کیا مانگوں

ساؔحر چونکہ ایک ترقی پسند شاعر تھے،اس لئے ہر جگہ ان کا رویہ بہت حقیقت پسندانہ ہوتا تھا،انہوں نے انسانی معاشرے کوخواب وخیال کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں لانے کا کارنامہ انجام دیا۔اُن کی نظم ''خوب صورت موڑ''ایک ایسی ہی نظم ہے،جو ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ پیار انسان کے لئے بہت کچھ تو ہے،مگر کسی بھی حال میں سب کچھ نہیں۔ آیئے ساؔحر کی اس نظم کے کچھ حصہ سے محظوظ ہوتے ہوئے آگے بڑھیں ؎

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دل نوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں سے
نہ ظاہر ہو تمہاری کشمکش کا راز نظروں سے
تعارف روگ ہوجائے تو اس کا بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اُسے ایک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

ساؔحر نے اپنی زندگی میں محبت کی چوٹ بار بار کھائی،ناکامیوں سے ان کا سامنا قدم قدم پر ہوا،اُن کا دل زخموں سے بھرا ہوا تھا پھر بھی اُن کے ہونٹوں پر وفا اور پیار کے خوب صورت نغمے ہمیشہ مچلتے رہتے تھے ؎

کون آیا کہ نگاہوں میں چمک جاگ اٹھی
دل کے سوئے ہوئے تاروں میں کھنک جاگ اٹھی
کس نے یوں میری طرف دیکھ کے بانہیں کھولیں
شوخ جذبات نے سینے میں نگاہیں کھولیں
ہونٹ تپنے لگے، زلفوں میں لچک جاگ اٹھی
دل کے سوئے ہوئے تاروں میں کھنک جاگ اٹھی

جب ہم بہت کم عمر ہوتے ہیں،اس وقت سے ہی احساس کی سطح پر کوئی سایہ ہمارے ساتھ چلنا شروع کر دیتا ہے،پھر دھیرے دھیرے تصور کے آئینے میں اس کی شکل وصورت کچھ کچھ واضح ہونے لگتی ہے،بالکل واضح نہیں ہوتی ہے اور جب یہ تصویر بالکل واضح ہوکر ہمارے ذہن کے اُفق پر اُبھرتی ہے تب ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ تو میرا محبوب ہے، میرے خوابوں کا تاج محل،جس کو حقیقت کا رنگ دینا ابھی باقی ہے۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والا وجود خواہ لڑکی کے پیکر میں ہو یا لڑکے کے،وہ آدم کی تصویر ہو یا حوا کا سراپا،دونوں کے پہلو میں دھڑکنے والا دل،تنہائی کا احساس کرتا ہے اور اِسی احساس کے ساتھ شروع ہوتا ہے محبت کا سفر......ہم سفر کی تلاش وجستجو......دل کے صحرا میں اُبلتے ہوئے پانی کے کسی چشمے کو پانے کی تمنا اور آرزو......یہ انسان کے سفر کا پہلا زینہ ہوتا ہے۔اُمیدوں کا چاند کہیں بہت دور خیالوں کے آسمان پر جگمگاتا رہتا ہے،اُسے ہم دیکھتے بھی ہیں،لیکن چھو نہیں سکتے، ہاں ایسا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ کوئی خوشبو آس پاس میں کہیں ہے، چاروں طرف بکھری اور پھیلی ہوئی،لیکن کہاں ہے یہ معلوم نہیں ہوتا۔ اِسی نامعلوم خواب اور خوشبو کو،حقیقت کا رنگ بھر کر گلاب کرنے کا عمل آگے جا کر پیار میں تبدیل ہوجاتا ہے،جو ہمیں زندہ رہنے کا اور زندگی میں کچھ کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔تمنائیں تصورات کی بانہوں میں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں،پورے وجود پر خمار کا بادل چھا جاتا ہے اور احساس کا بدن ٹوٹنے لگتا ہے۔

جب برسوں کے پیاسے بدن پر،پیار ومحبت کی ہلکی ہلکی بارش کی پھواریں پڑنے لگتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پورے چاند کی

رات میں تاج محل کی دیواروں سے چپکا ہوا معشوق بھی جیسے سنگ مرمر کا ہوگیا ہو اور اس کے بدن سے ہوائیں اٹکھیلیاں کر رہی ہوں۔ یہ وہ دور ہوتا ہے جب کسی کی انگلی سے انگلی چھو جانے کے بعد لمس کی خوشبو پورے بدن میں رچ بس جاتی ہے اور پھر ذہن کے آسمان پر چاروں طرف گھٹائیں چھا جاتی ہیں، سیپ کا منھ کھل جاتا ہے تا کہ بارش کی کوئی بوند اس کے وجود کے بہت اندر اتر کر موتی میں تبدیل ہو سکے۔ ہر صدف کی قسمت کا عروج یہی ہوتا ہے......امرتا پریتم ایک جگہ تحریر کرتی ہیں:

''دل کی تہوں میں سب سے پہلا درد جس کے چہرے
کی تابانی میں دیکھا، وہ اس مذہب کا تھا جس مذہب
کے لوگوں کے لئے گھر کے برتن بھی اچھوت قرار دے
دیئے جاتے تھے۔ ساحؔر میرے لئے ایک خیال تھا، چمکتا
ہوا ایک ستارہ یا پھر میرے اپنے خواب و خیال کا ایک
جادو......میرے دل کو تو صرف یہ معلوم تھا کہ میں نے
ساحر سے محبت کی تھی۔''

دوسری طرف ساحؔر یہ کہتے ہیں۔

وفا شعار کئی ہیں، کوئی حسیں بھی تو ہو
چلو پھر آج اسی بے وفا کی بات کرتے ہیں

ساحؔر لدھیانوی کے دل میں حادثے پر حادثہ ہوتا رہا اور وہ ان کا مقابلہ بھی کرتے رہے، ہاں جب کبھی بہت مایوس ہو جاتے تو کوئی یاسیت سے بھرا ہوا شعر بھی نوکِ قلم پر آ جاتا۔

اس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

ساحؔر لدھیانوی کی نظموں کا جب ہم ڈوب کر مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ساحؔر نے واقعی شاعری نہیں ساحری کی ہے اور اپنی بیشتر نظموں میں اپنے دل کا درد بہت ہی تاثیر بھرے انداز میں بیان کیا ہے، ان کی نظموں میں ان کی محبت کی کہانی ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ چلتی اور آگے بڑھتی ہے۔

یہی فضا تھی، یہی رُت، یہی زمانہ تھا
یہیں سے ہم نے محبت کی ابتدا کی تھی
میں پھول ٹانک رہا ہوں تمہارے جوڑے میں
تمہاری آنکھ مسرت سے جھکتی جاتی ہے
نہ جانے آج میں کیا بات کہنے والا ہوں
زبان خشک ہے، آواز رُکتی جاتی ہے
مرے گلے میں تمہاری گداز بانہیں ہیں
تمہارے ہونٹوں پہ میرے لبوں کے سائے ہیں
مجھے یقین، کہ ہم اب کبھی نہ بچھڑیں گے
تمہیں گمان کہ ہم مل کے بھی پرائے ہیں

(پرچھائیاں)

ساحؔر کی ایک اور پیاری نظم ''یکسوئی'' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

میں تصوف کے مراحل کا نہیں ہوں قائل
میری تصویر پہ تم پھول چڑھاتی کیوں ہو
میں سمجھتا ہوں تقدس کو تمدن کا فریب
تم رسومات کو ایمان بتاتی کیوں ہو
جب تمہیں مجھ سے زیادہ ہے زمانہ کا خیال
پھر مری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو
تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کردو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

جہاں کہیں بھی حسن کا کوئی ذرہ نظر آتا ہے، فنکار کی نگاہ اُس کو دیکھتی ہے اور آسمان کی وسعتوں میں چمکتے ہوئے چاند، ستاروں کو زمین پر اتارنے کی تمنا بھی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔

ساحؔر لدھیانوی کی پوری شعری کائنات ایسی ہی معصوم تمناؤں کی بانہوں میں لپٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کائنات اتھاہ ہے، لیکن تمناؤں اور آرزوؤں کی بھی کوئی حد مقرر نہیں ہوتی ہے، جب بھی چمن میں کوئی پھول کھلتا ہے، ہوائیں اُس کے بدن کو چھوتی ہیں، خوشبو کا جنم ہوتا ہے اور پھر خوشبو چاروں دِشاؤں میں پھیل جاتی ہے اور ہمیں اپنے ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ دل کے کورے کاغذ پر حروف ابھرنے لگتے ہیں، لکیریں ابھرنے اور ڈوبنے لگتی ہیں اور جب ہم غور سے اُن حروف کو دیکھتے ہیں تو ایک لفظ سے ہماری نظر آشنا ہوتی ہے اور وہ لفظ ہوتا ہے

''پیار'' پیار جب جواں ہوتا ہے تو دل میں لکیریں بھی گہری ہونے لگتی ہیں اور پھر یہی لکیریں پیکر میں تبدیل ہوجاتی ہیں اور جو پیکر ابھرتا اور بنتا ہے وہ محبوب کا پیکر ہوتا ہے اور تب شروع ہوتا ہے ایک بالکل انجان سفر...... تاحد نظر، تنہائی کا ایک لامحدود صحرا، وقت کی تیز دھوپ، لیکن قدموں کو فرار نہیں، ہر پل جنون کے قدموں کی چاپ، ایک اجنبی صدا، جو بے چین کر دیتی ہے کسی بھی حساس دل کے انسان کو۔ امریتا پریتم نے ساؔحر کے تعلق سے ایک جگہ تحریر کیا ہے:

''ساؔحر کو ایک بڑا Complex تھا کہ وہ خوب رو نہیں، ایک روز اس نے میری بچی کو گود میں بیٹھا کر کہا: تم کو ایک کہانی سناؤں؟ اور جب میری بچی کہانی سننے کے لئے تیار ہوئی تو وہ سنانے لگا: ایک تھا لکڑ ہارا، وہ شب و روز جنگل میں لکڑیاں چیرتا تھا، پھر ایک روز اس نے جنگل میں ایک شہزادی کو دیکھا وہ بڑی حسین تھی، لکڑ ہارے کا جی چاہا کہ وہ شہزادی کو لے کر بھاگ جائے...... پھر؟ میری بیٹی نے بڑی معصومیت سے سوال کیا، اس وقت اس کی عمر کہانیوں میں ہوں ہاں کرنے کی تھی، اس لئے بڑی توجہ سے وہ کہانی سن رہی تھی اور میں اپنی بیٹی کی معصومیت پر ہنس رہی تھی کہ وہ کہانی میں دخل نہیں دے رہی ہے...... وہ کہہ رہا تھا...... لیکن تھا تو لکڑ ہارا نا، وہ شہزادی کی طرف صرف دیکھتا رہتا۔ دور، فاصلے پر کھڑے ہوکر...... پھر وہ اداس ہوکر لکڑیاں کاٹنے میں لگ جاتا...... سچی کہانی ہے نا؟ میری بچی نے کہا اور وہ ہم دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔ ساحر ہنستا ہوا میری جانب دیکھنے لگا...... اور بچی سے پوچھنے لگا، تم وہاں پر جنگل میں تھیں نا؟ بچی نے ہاں کہہ کر سر ہلایا، میں نہیں جانتی ہوں کہ اس نے یہ کیوں کہا...... ساؔحر نے گود میں بیٹھی ہوئی بچی سے پھر پوچھا: تم نے اس لکڑ ہارے کو بھی دیکھا تھا نا؟ وہ کون تھا؟ بچی کو اس لمحے کوئی الہام اترتے میں نے دیکھا، کہنے لگی: 'آپ!' ساؔحر نے پھر پوچھا: اور وہ شہزادی کون تھی؟ ماما اور بچی ہنسنے لگی۔ ساؔحر مجھ سے کہنے لگا۔ دیکھا بچوں کو سب معلوم ہوتا ہے۔

بہت گھٹن ہے کوئی صورت بیاں نکلے
اگر صدا نہ اٹھے کم سے کم فغاں نکلے

ساؔحر کی شاعری میں اس کی کھوئی ہوئی ناکام محبت کی داستان ہر جگہ موجود ہے، ایک ادھوری تصویر جو ذہن کے پردے پر ابھرتی اور پھر کھو جاتی ہے۔

میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ ملا
میں وہ نغمہ ہوں جسے پیار کی محفل نہ ملی
وہ مسافر ہوں جسے کوئی بھی منزل نہ ملی

پیار کی راہوں میں منزل کم لوگوں کو ملتی ہے اور کچھ دور ساتھ چل کر بچھڑ جانا جیسے محبت کرنے والوں کا مقدر ہوتا ہے، لیکن یہی بچھڑنا پیار کا عروج ہوتا ہے، تب کسی کی یادیں ہمیں زندگی کے سفر میں جینے کا ایک نیا حوصلہ دیتی ہیں، بظاہر ہم تنہا ہوتے ہیں، لیکن کوئی سایہ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

جیون کے سفر میں راہی، ملتے ہیں بچھڑ جانے کو
اور دے جاتے ہیں یادیں تنہائی میں تڑپانے کو
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات
ایک انجان حسینہ سے ملاقات کی رات
میرے نغموں میں جو بستی ہے وہ تصویر تھی وہ
نوجوانی کے حسیں خوابوں کی تعبیر تھی وہ
آسمانوں سے اتر آئی تھی جو رات کی رات
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات

عورت کا احترام ساؔحر کے دل میں لہو بن کر ہمیشہ دوڑتا رہا، عورت کے درد کو انہوں نے پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اس کو اپنی شاعری کا موضوع بھی بنایا۔ عورت کے تعلق سے اُن کی ایک نظم آج بھی لوگوں کے ذہن و دماغ میں محفوظ ہے اور ساؔحر کی نظموں میں ایک شاہکار نظم کی حیثیت رکھتی ہے، چند بند ملاحظہ فرمائیں۔

عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اُسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا، جب جی چاہا دھتکار دیا

تلتی ہے کہیں دیناروں میں، بکتی ہے کہیں بازاروں میں
ننگی نچوائی جاتی ہے، عیاشوں کے درباروں میں
عورت سنسار کی قسمت ہے، پھر بھی تقدیر کی بیٹی ہے
اوتار پیمبر جنتی ہے پھر بھی شیطان کی بیٹی ہے
یہ وہ بدقسمت ماں ہے جو بیٹوں کی سیج پہ لیٹی ہے
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اُسے بازار دیا

جب ساحر کا تذکرہ ہوتا ہے تو ساحر کی معصومیت ہاتھ باندھ کر ہمارے سامنے کھڑی نظر آتی ہے، جیسے کہہ رہی ہو۔

جرم الفت پہ ہمیں لوگ سزا دیتے ہیں
کیسے نادان ہیں شعلوں کو ہوا دیتے ہیں
ہم نے دل دے بھی دیا، عہد وفا لے بھی لیا
آپ اب شوق سے دے لیں، جو سزا دیتے ہیں

ساحر نے پیار کے لئے سب کچھ کیا، پیار ساحر کی زندگی کے زیروبم میں سمایا ہوا تھا، اس کی سانسوں میں خوشبو بن کر رچ بس گیا تھا۔ ساحر اپنے محبوب سے جو خوش ہوتے ہیں تو اس سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

اپنا دل پیش کروں، اپنی وفا پیش کروں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا تجھے کیا پیش کروں
میرے خوابوں میں بھی تو میرے خیالوں میں بھی تو
کون سی چیز تجھے تجھ سے جدا پیش کروں
نغمہ و شعر کی سوغات کسے پیش کروں
یہ چھلکتے ہوئے جذبات کسے پیش کروں

لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ محبوب بے رخی پر آمادہ ہوجاتا ہے اور تب عاشق کے دل سے جو فریاد نکلتی ہے وہ اضطراب اور بے چینی کی ایک درد بھری داستان ہوتی ہے اور وہ سمجھ نہیں پاتا کہ ''جائیں تو کدھر جائیں'' پیار میں جب بے کیف لمحے سامنے آکر کھڑے ہوجاتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دل میں کوئی مسلسل نشتر لگا رہا ہو۔ پیار کے سفر میں وصل کے لمحات جتنے خوب صورت ہوتے ہیں، فراق کے لمحات اتنے ہی تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتے ہیں۔ تب شاعر کا حساس دل بہت اُداس اور مغموم ہوجاتا ہے اور اُس کے جذبات بھی جیسے سرد پڑ جاتے ہیں، ایسے ہی جذبات واحساسات سے جب ساحر دوچار ہوتے ہیں تو ایک اُداس نظم ان کی نوک قلم پر آ کر ان کے پڑھنے اور چاہنے والوں کو بھی اُداس اور بے کیف کر دیتی ہے۔

تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے
ہم بھری دنیا میں تنہا ہوگئے

ساحر لدھیانوی محض ایک فلمی شاعر نہیں تھے، بلکہ وہ اردو کے ایک انقلابی شاعر بھی تھے، ان کے یہاں ظالمانہ نظام کے خلاف شدید احتجاج بھی ملتا ہے، انہوں نے اپنی شاعری میں غریبوں اور مزدوروں کے درد کو بھی پیش کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے ان کے دردمندانہ احساسات وجذبات کو مزید مستحکم کیا، ان کی شاعری میں ہمیں سماج کی تصویر صاف نظر آتی ہے، ان کی نظم ''چکلے'' ان کے اندر کے انسانی احساسات وجذبات کا بہت خوب صورت اظہار ہے۔

یہ بھی نگاہیں حسینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زمینوں کی جانب
ثنا خوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں
مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت، زلیخا کی بیٹی
ثنا خوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں

ساحر ایک انسان دوست اور امن پسند فنکار تھے، شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جنگ کو سماج کا ایک بڑا مسئلہ قرار دیا اور یہ کہا۔

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
اس لئے اے شریف انسانو!
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں
شمع جلتی رہے تو بہتر ہے

ساحر لدھیانوی کی یہ نظم ''اے شریف انسانو'' اردو نظموں کی تاریخ میں

شاید کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی ہے۔
ساؔحر لدھیانوی کی وفات ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو ہوئی۔ جب جواہر لال نہرو کا انتقال ہوا تھا تو ساؔحر نے کہا تھا۔

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مٹ جانے سے انسان نہیں مرجاتے

آج خود ساؔحر کے لئے بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے، بظاہر ساحر کی جسمانی موت ہوچکی ہے لیکن وہ اپنے فن کے زنداں خانے میں آج بھی زندہ ہے۔ ساؔحر کی نظم ''تاج محل'' کا اگر ذکر نہ کیا جائے تو ساحر کی داستانِ حیات مکمل نہیں ہوسکتی ہے، اس نظم کا یہ شعر تو گویا ضرب المثل بن چکا ہے۔

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

ساؔحر آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، لیکن ان کے احساسات و جذبات الفاظ کے پیکر میں ڈھل کر آج بھی ہمارے ذہن و دل کے تاریک گوشوں کو منور کررہے ہیں اور ہم ساؔحر کی کہیں بہت قریب سے آتی ہوئی آواز کو صاف سن رہے ہیں۔

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لئے
تو اب سے پہلے ستاروں میں بس رہی تھی کہیں
تجھے زمیں پہ بلایا گیا ہے میرے لئے

آج بھی روایتی اور رومانی شاعری کے لوگ دیوانے ہیں، ایسی شاعری جو دل کے تاروں کو چھوکر پیار کا نغمہ پیدا کرسکے آج بھی پسند کی جاتی ہے۔ خواہ نئی نسل کے لوگ ہوں یا پرانی نسل کے افراد، شاعری میں اگر حسن اور زندگی کی رمق موجود ہوتو دل میں فطری طور پر ایک ہلچل سی پیدا ہوتی ہے، تمنائیں تصورات کی حسین اور مرمریں بانہوں میں جیسے انگڑائیاں سی لینے لگتی ہیں اور احساس کا بدن ٹوٹنے لگتا ہے۔ بقول ساؔحر۔

اِدھر بھی خاک اڑی ہے اُدھر بھی خاک اڑی
جہاں جہاں سے بہاروں کے کارواں نکلے

کبھی کبھی انسان یہ جان کر بھی کہ وہ اپنے خوابوں کو حقیقت کا پیکر نہیں دے سکتا ہے، آسمان کی بلندیوں پر چمکتے ہوئے کسی ستارے کو چھونے کی خاطر اپنے چھوٹے ہاتھوں کو اوپر کی جانب بڑھاتا ہے، لیکن لاحاصل اور اس کی آرزو بھی صرف چاند اور چکور کی صدیوں پرانی کہانی کا محض ایک حصہ بن کر رہ جاتی ہے، پھر بھی وہ خوش ہوتا ہے، شاید یہ سوچ کر کہ۔

انہیں اپنا نہیں سکتا، مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھوکر جی لیا میں نے

خواب ہمیں خوشیوں کی سوغات دیتے ہیں، خواب ہمارے خالی دامن کو امیدوں کے موتیوں سے بھر دیتے ہیں اور شاید یہ سچ ہے کہ اگر ہماری پلکوں پر خوابوں کے سایے نہ ہوں تو ہمارا زندہ رہنا بھی محال ہوجائے۔

ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنا کے سہارے جی لیا میں نے

ساؔحر نے اپنی تمام زندگی وقت اور حالات کے تیز دھارے کی زد میں گزار دی، لیکن کبھی ان کی زندگی کو ساحل نصیب نہ ہوسکا۔ وہ زندگی بھر تنہا رہے، لیکن کسی نے آگے بڑھ کر ان کو سہارا نہیں دیا، ان کو اپنے سینے سے لگا کر پیار نہیں کیا، جس نے پیار کیا اس کے سامنے سماج کی ایک دیوار حائل تھی اور اس دیوار کو مسمار کرنے کا حوصلہ وہ اپنے اندر نہیں سمیٹ پائی۔ بس وہ صرف احساس کی حد تک اپنے من مندر میں ساؔحر کو محبت اور وفا کا ایک دیوتا تصور کرکے اس کے قدموں میں شردھا کے پشپ ارپت کرتی رہی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی انسان کی حقیقی زندگی سے سات سمندر دور رہ کر بھی دل کی ہر دھڑکن میں شامل رہتا ہے اور کوئی آنکھوں کے بالکل سامنے ہوکر بھی دل کی دہلیز سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ ساؔحر نے شادی نہیں کی، وہ کسی ایسی عورت کے قرب سے بہت دور رہا جس کو اس کے دل نے قبول نہیں کیا اور جس کو دل نے قبول کیا وہ ہر پل وجود کے آس پاس رہا اور اس کے پیار کی خوشبو اس نے ہمیشہ اپنی رگ جاں کے نزدیک محسوس کی۔ ساؔحر نے اپنی زندگی کی محرومیوں پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

مایوسیوں نے چھین لئے دل کے ولولے
وہ بھی نشاط روح کا ساماں نہ کرسکے
موت پائی صلیب پر ہم نے
عمر بن باس میں بتائی گئی

اور پھر یہ شعر کہ ؎

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا زمانے نے
کہ آبِ حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

ساحؔر کے لب ولہجہ میں جو تلخیاں ہمیں محسوس ہوتی ہیں وہ شاید اُن کے عشق کی ناکامیوں کی وجہ سے ہیں۔ انسان کی زندگی میں جب کوئی شئے مرکزی حیثیت حاصل کر لیتی ہے تو اُسے پالینا زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور کھو دینا جیون کا سب سے بڑا غم بن جاتا ہے۔ یہ غم کبھی کبھی اتنا بڑا بن جاتا ہے کہ انسان ایک زندہ لاش ہو کر رہ جاتا ہے ؎

یہ تیری یاد ہے یا میری اذیت کوشی
ایک نشتر سا رگ جاں کے قریب آج بھی ہے

ساحؔر جب ذرا اور اُداس ہوتے ہیں تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ؎

مجھے گلے سے لگالو بہت اُداس ہوں میں
غم جہاں سے چھڑالو، بہت اُداس ہوں میں

محبت میں اُداسی بتاتی ہے کہ راکھ کے اندر چنگاری ابھی باقی ہے ؎

یوں اچانک تری آواز کہیں سے آئی
جیسے پربت کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے
یا زمینوں کی محبت میں تڑپ کر ناگاہ
آسمانوں سے کوئی شوخ ستارا ٹوٹے

ساحؔر کو احساس تھا کہ وہ جس کو اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتے ہیں وہ متاع غیر ہے، پھر بھی وہ اس سے یہ معصوم سوال ضرور کرتے ہیں ؎

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

دنیا میں نہ جانے کتنے لوگ ایسے ہیں جن کی قسمت میں کسی کا پیار نہیں ہوتا ہے، جو اِس بات کے لئے بھی ترستے ہیں کہ کاش کوئی تو ایسا ہوتا جس کو وہ پیار کر سکتے ؎

مری بربادیوں کی داستاں ان تک پہنچ جائے
سوا اس کے محبت کے خدا سے اور کیا مانگوں

ساحؔر کے دل کے اندر کبھی کبھی بے کیفی کی ہوائیں بھی چلتی ہیں، بیزاری کی کیفیتیں بھی پیدا ہوتی ہیں اور تب وہ اپنے احساسات سے مجبور ہو کر محبوب کو یوں مخاطب کرتے ہیں ؎

تم اگر مجھ کو نہ چاہو تو کوئی بات نہیں
تم کسی اور کو چاہوگی تو مشکل ہوگی

یہ کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ساحؔر نے ایک پرآشوب دور پایا تھا اور اپنی ذاتی صبح و شام میں زندگی کے زہر کو گھونٹ گھونٹ پیا تھا، اتنا ہی نہیں انہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا بھی تھا، وہ اپنی زندگی کے تجربے کو سمیٹ کر شاعری کی کشکول میں یوں پیش کرتے ہیں ؎

یہ محلوں یہ تختوں یہ تاجوں کی دنیا
یہ انساں کے دشمن سماجوں کی دنیا
یہ دولت کے بھوکے رواجوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

ساحؔر آج ہمارے درمیان نہیں، لیکن ان کے پیار بھرے نغمے آج بھی ہمارے دلوں کو محبت کی شمع روشن کرنے کا حوصلہ دے رہے ہیں، اس لئے کہ محبت میں زندگی کی معراج ہے، محبت کے بغیر ہماری زندگی دردوغم کا ایک ریگستان بن جاتی ہے اور ہمارے احساس کے پاؤں جلنے اور سلگنے لگتے ہیں، عشق و محبت کا مرتبہ ہی کچھ اور ہے، واقعی ؎

تخت کیا چیز ہے اور لعل و جواہر کیا ہیں
عشق والے تو خدائی بھی لٹا دیتے ہیں

ساحؔر کے ایک خوب صورت گیت کے یہ بول آج بھی ہمارے ذہن و دماغ میں تازہ بہ تازہ ہیں ؎

میں پل دو پل کا شاعر ہوں
پل دو پل میری کہانی ہے
پل دوپل میری ہستی ہے
پل دو پل میری جوانی ہے
میں پل دو پل کا شاعر ہوں
پل دو پل میری جوانی ہے

❀❀❀

صادق علی انصاری
198-A, Shaikh Sarai, Sitapur 261001(U.P.) (Mob. 9616215149)

عبدالحئی ساحرؔ گیتوں اور نظموں کے آئینے میں

فلمی دنیا نے یوں تو نقش لائل پوری، گلزارؔ، راجندر کرشن، اسعدؔ بھوپالی، جان نثار اخترؔ، پردیپ، ایس، ایچ بہاری، نخشبؔ جارجوی، کیفی اعظمی، گوپال داس نیرجؔ، بھرت ویاس، راجہ مہدی علی خاں، حسرتؔ جے پوری، آنند بخشی، شیمؔم جے پوری، کیفؔ بھوپالی، مجروحؔ سلطان پوری، خمارؔ بارہ بنکوی، شکیلؔ بدایونی، اندر جیت سنگھ اور ساحرؔ لدھیانوی جیسے متعدد شاعر ونغمہ نگار فلم بینوں کو دیے، لیکن ان سبھی میں جو عزت، شہرت اور مقبولیت، شکیلؔ بدایونی، مجروحؔ سلطان پوری اور ساحرؔ لدھیانوی کو ملی وہ اور کسی نغمہ نگار کے مقدر میں نہیں آئی اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مندرجہ بالا نغمہ نگاروں و گیت کاروں میں عبدالحئی ساحرؔ کے گیت لکھنے کا اسلوب سب سے الگ رہا۔ فلمی سچویشن کے مطابق ساحرؔ نے گیت ضرور لکھے، لیکن گیتوں کا معیار کبھی گرنے نہیں دیا۔

ساحرؔ لدھیانوی کی شاعری کی ابتدا در اصل نظموں سے ہوئی۔ فلموں میں آنے سے قبل ساحرؔ کو جو بھی شہرت ملی تھی اس میں ان کی نظموں کا ہی عمل دخل ہے۔ ترقی پسند تحریک سے جڑے ہونے کے باوجود ان کی نظموں میں عام قسم کی نعرے بازی کبھی نہیں پائی گئی۔

ساحرؔ کے بارے میں عوامی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ نظم کا شاعر ہے، اسی لئے اس کے یہاں غزلیں کم ملتی ہیں پھر بھی جائزہ لیا جائے تو ساحرؔ غزل سے اپنا دامن بچا نہیں سکا ہے۔ اس نے محبت صرف اپنی والدہ اور نفرت اپنے باپ سے کی ہے اس لئے اس کی غزلوں میں کچھ عجیب سا جھلاہٹ بھرا تاثر دیکھنے کو ملتا ہے۔

ہمارے دور کی تہذیب میں قبا ہی نہیں
اگر قبا ہو تو بند قبا کی بات کریں

ساحرؔ نے غزل کی کہنہ وروایتی ہیئت سے اس طرح انحراف کیا ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں کو مقطع سے بچائے رکھا ہے۔ ان کی کسی بھی غزل میں تخلص کا استعمال نہیں دکھائی دیتا ہے۔

اپنے دوست لیش چوپڑہ کی شادی کے موقع پر ساحرؔ نے جو نظم لکھی، اس کے اشعار پڑھنے اور سننے سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ رسم انقطاع عہد اُلفت، یہ حیاتِ نو
محبت رورہی ہے اور تمدن مسکراتا ہے
یہ شادی خانہ آبادی ہو مرے محترم بھائی
مبارک کہہ نہیں سکتا مرا دل کانپ جاتا ہے

دنیا بھر کے تمام مفکرین اور دانشوروں نے تاج محل جیسی حسین و جمیل عمارت (مقبرہ) کی بہت تعریف کی ہے، لیکن ساحرؔ لدھیانوی نے اس تاج محل کو الگ نظریہ سے دیکھا اور تنقید کیا ہے۔

تاج تیرے لئے اک مظہر الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیِ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے
میری محبوب ! انہیں بھی تو محبت ہو گی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام ونمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

ساحرؔ کی کامیاب نظموں میں ''نذرکالج''، ''کسی کو اُداس دیکھ کر''، ''صبح نو روز''، ''چکلے''، ''فنکار''، ''کبھی کبھی''، ''فرار''، ''کل اور آج''، ''اسی دوراہے پر''، ''خودکشی سے پہلے''، ''نورجہاں کے مزار پر''، ''مادام''، ''شکست زنداں''، ''خوبصورت موڑ''، ''خون پھر خون ہے''، ''اے شریف انسانو''، ''ورثہ''، ''پرچھائیاں'' شامل ہیں۔ نظم ''پرچھائیاں'' کے بارے میں

ساحرؔ لدھیانوی رقم طراز ہیں:

''پرچھائیاں میری پہلی طویل نظم ہے، اس وقت ساری دنیا میں امن اور تہذیب کے تحفظ کے لئے جو تحریک چل رہی ہے یہ نظم اس کا ایک حصہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر نوجوان نسل کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ اسے جو دنیا اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی ہے وہ آئندہ نسلوں کو اس سے بہتر اور خوبصورت دنیا دے کر جائے، میری یہ نظم اس کوشش کا ادبی روپ ہے۔''

''پرچھائیاں'' کا بیانیہ ایک کہانی جیسا ہے۔ چاندنی رات کے پرسکون منظر سے نظم شروع ہوتی ہے جس کا مرکزی کردار دُکھے ہوئے دل اور لٹی ہوئی زندگی کا فن کار ہے، جسے گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے یاد آتے چلے جاتے ہیں اور وہ انہیں ہمارے سامنے رکھتا چلا جاتا ہے ۔

جواں رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خواب مرمریں کی طرح
تصورات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح
وہ پیڑ جن کے تلے ہم پناہ لیتے تھے
کھڑے ہیں آج بھی ساکت کسی امیں کی طرح
یہی فضا تھی، یہی رُت یہی زمانہ تھا
یہیں سے ہم نے محبت کی ابتدا کی تھی
دھڑکتے دل سے لرزتی ہوئی نگاہوں سے
حضور غیب میں ننھی سی التجا کی تھی
کہ آرزو کے کنول کھل کے پھول ہو جائیں
دل و نظر کی دعائیں قبول ہو جائیں

میں پھول ٹانک رہا ہوں تمہارے جوڑے میں
تمہاری آنکھ مسرت سے جھکتی جاتی ہے
نہ جانے آج میں کیا بات کہنے والا ہوں
زبان خشک ہے آواز رکتی جاتی ہے

تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
مرے گلے میں تمہاری گداز باہیں ہیں
تمہارے ہونٹوں پہ میرے لبوں کے سائے ہیں
مجھے یقیں ہے کہ اب ہم کبھی نہ بچھڑیں گے
تمہیں گمان کہ ہم مل کے بھی پرائے ہیں

نظم آگے بڑھتی ہے تو ٹاپوں کی صداؤں اور بارود کی بوجھل بدبو سے ہوا پرسکون فضا کو خراب کرنے لگتی ہے ۔

ناگاہ لہکتے کھیتوں سے ٹاپوں کی صدائیں آنے لگیں
بارود کی بوجھل بو لے کر پچھّم سے ہوائیں آنے لگیں
فوجوں کے بھیانک بینڈ تلے چرخوں کی صدائیں ڈوب گئیں
جیپوں کی سلگتی دھول تلے پھولوں کی قبائیں ڈوب گئیں

جب جنگ کے بادل منڈلاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو شاعر مصالحت کے بارے میں ہی سوچنے لگتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے ۔

اٹھو کہ آج ہر اک جنگ جو سے یہ کہہ دیں
کہ ہم کو کام کی خاطر کلوں کی حاجت ہے
ہمیں کسی کی زمیں چھیننے کا شوق نہیں
ہمیں تو اپنی زمیں پر ہلوں کی حاجت ہے
گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے ، مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہا ئیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے ، مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

ساحرؔ لدھیانوی کی داستان محبت خاصی عبرت انگیز رہی۔ ان کے نام کے ساتھ کئی نام جڑے، لیکن وہ خود کو کسی نام کے ساتھ نہیں جوڑ سکے۔ انہوں نے خوابوں کے آسرے پر تمام عمر تنہا گزاری۔ ساحرؔ نے خواب بہت بنے، لیکن ازدواجی زندگی میں کچھ بن نہیں سکے۔ عالمی سطح پر امن و امان چاہنے والا یہ شخص تاریخ ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو اپنے رب حقیقی سے جاملا۔ جب بھی بہتر شاعری اور نغمہ نگاری کا تذکرہ ہوگا، لدھیانہ کے عبدالحئی ساحرؔ کا نام ضرور لیا جائے گا۔

❀❀❀

آفتاب احمد

ساحرؔ لدھیانوی کی نظمیہ شاعری

ساحرؔ لدھیانوی کی پیدائش لدھیانہ کے ایک جاگیردار گھرانے میں ۸/مارچ ۱۹۲۱ء کو ہوئی۔ ساحرؔ کے والد کا نام چودھری فضل محمد تھا، انہوں نے ساحرؔ کا نام عبدالحئیٔ رکھا۔ ساحرؔ کے والد میں وہ تمام خوبیاں و خامیاں تھیں جو جاگیردار طبقے کے لوگوں کی عادت و ذوق اور شوق میں شامل ہوتی ہیں۔ انہوں نے کئی شادیاں کی، مگر اولاد سے محروم رہے۔ اسی محرومی کو دور کرنے کے لئے ایک کے بعد ایک شادیاں کرتے چلے گئے۔ ساحرؔ کی والدہ سردار بیگم ان کی گیارہویں بیوی تھیں۔

ساحرؔ نے جہاں ایک طرف اپنے ذہن کے احساسات کی پاسداری میں رومانی نظمیں تخلیق کی وہیں، دوسری طرف انہوں نے انسانی اقدار کے بلندی کی بات بھی کی ہے۔ عظمت نسواں، سیاست، انقلاب آزادی کے حوالے سے ساحرؔ نے پوری زندگی اردو ادب کی خدمت کرتے ہوئے گزار دی۔ ساحرؔ کی ادبی تخلیق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں خود ساحرؔ کا ضمیر شامل ہے اور یہی خوبی ان کی شاعری کو اچھی شاعری بناتی ہے اور قاری و ناقد کو متاثر کرتی ہے۔

جہاں تک شاعری کے کسی نظریے یا فکر و فن کے کسی خاص پیمانے پر پورا اترنے کی بات ہے اس سلسلے میں خود ساحرؔ کا خیال یہ ہے کہ:

''اچھی شاعری بھلے ہی کسی مخصوص نظریے پر پوری نہ اترتی ہو، لیکن اس کی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔''

مطلب یہی ہے کہ لکھتے وقت ادیب کو اپنی شخصیت کے ساتھ سچا رہنا چاہئے۔ جو کچھ بھی کہا اور لکھا جائے اس میں ضمیر کی شرکت ضروری ہے، تبھی ایک آفاقی ادب تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ اندر سے بھی کچھ ایسا لگتا ہو، جو باہر کی دنیا میں نظر آتا ہے، تبھی سچی شخصیت کا اظہار اور شعر گوئی کا حق ادا ہو سکتا ہے اور اگر ادیب اپنے مزاج کے خلاف کسی لیبل کے لئے لکھتا ہے تو اندر سے کسی طرح کی تسکین ممکن نہیں۔ ایک ادیب اپنی حقیقی زندگی میں جھوٹ بولتا ہو تو شاید کوئی بات نہیں، مگر اسے اپنی تخلیق میں سچ بولنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جینے کے لئے سانس کا لینا ضروری۔ ساحرؔ نے ان سب باتوں کا اہتمام کیا اور اپنے مشاہدے اور تجربات کی بدولت آفاقی ادب تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ساحرؔ کے یہاں محبت کی کھلتی کلیاں ہیں، پھول ہیں، مگر ان کلیوں سے لدی شاخوں میں کانٹے صاف طور پر نظر آتے ہیں جو ہمیشہ ''ردعمل'' کے طور پر ان کی چشم تنہائی کو اشک بار کرتے ہیں۔ کہیں اپنے محبوب سے ملنے کی خوشی، کہیں بچھڑنے کا غم، تو کہیں خود کے حالات پر ندامت۔

چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدتوں محو یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اُداس رہتا ہوں

ساحرؔ کے مجموعہ ''تلخیاں'' کی شروعات ان کی اسی نظم ''ردعمل'' سے ہوتی ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ اردو ادب میں غالبؔ کے دیوان کے بعد سب سے زیادہ چھپنے اور بکنے والی کتاب ساحرؔ کی ''تلخیاں'' ہے۔ اس مجموعہ کی خاص مقبولیت کا سبب ساحرؔ کی رومانی نظمیں ہیں۔ اس کے پچیس سے زائد اردو ایڈیشن اور ایک درجن سے زیادہ ہندی ایڈیشن آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی اور گورمکھی رسم الخط میں بھی ''پرچھائیاں'' کے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ ساحرؔ کی شاعری کے ترجمے مختلف زبانوں مثلاً روسی، فرانسیسی، چینی، انگریزی، عربی اور فارسی میں بھی اشاعت یافتہ ہیں۔ ''تلخیاں'' کی رومانی نظموں میں ''ردعمل''، ''ایک منظر''، ''ایک واقعہ''، ''نذر کالج''، ''سرزمین یاس''، ''شکست''، ''کبھی کبھی''، ''فرار''، ''ہراس''، ''اسی دوراہے پر''، ''ایک تصویر''، ''میں نہیں تو کیا''، ''متاع غیر''، ''انتظار''، ''تیری آواز''، ''خوبصورت موڑ''، ''میرے عہد کے حسینو'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

حسرت وارمان، یاس وامید اور ناکامی کی کیفیت کو ساحر نے اپنی نظم ''فرار'' میں، اپنے ماضی کی دستاویز بنا کر پیش کیا ہے، یہاں شاعر کے دل و جاں پر اداسی کا منظر چھایا ہوا ہے اس نظم میں وہ اپنے گزرے ہوئے ہر ایک پل کی اذیت پر ماتم کرتے ہیں اور یہ خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ میرے گزرے ہوئے کل کی داستاں کو میرے دل کے قبرستان میں ہی دفن رہنے دیا جائے۔

میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہنے دو
میرا ماضی مری ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں

ناکامی اور ناامیدی سے شاعر نے جہاں اپنی نظم کا آغاز کیا ہے، وہیں نظم کے اختتام پر شاعر کی فکر نے امید کے کنول بھی کھلائے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ماضی کے آئینے سے اپنا مستقبل روشن کرنے کی جستجو رکھتا ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جو ساحر کی تخلیقی فضا روشن کرتی ہے، جسے پڑھ کر قاری غور وفکر میں ڈوب جاتا ہے اور یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ محبت کا ناکام عاشق زندگی کی حقیقت سے نگاہ ملانے کی خوبیوں سے بھی واقف ہے۔ ساحر اپنی نظم کے آخر میں لکھتے ہیں۔

وہی گیسو، وہی نظریں، وہی عارض، وہی جسم
میں جو چاہوں تو مجھے اور بھی مل سکتے ہیں
وہ کنول جن کو کبھی ان کے لئے کھلنا تھا
ان کی نظروں سے بہت دور بھی کھل سکتے ہیں

نظم ''خانہ آبادی'' میں ساحر کے ایک دوست کی شادی پر ساحر کا نظریہ کچھ اس طرح سے خاص نظر آتا ہے کہ اس میں رسم ورواج کی زنجیروں میں جکڑی، دم توڑتی محبت پر وہ اظہار افسوس کرتے ہیں۔ ان کی اس نظم سے صاف عیاں ہے کہ وہ محبت کی سسکیاں نہیں برداشت کر سکتے۔

ترانے گونج اٹھے ہیں فضا میں شادیانوں کے
ہوا ہے عطر آگیں ذرہ ذرہ مسکراتا ہے
مگر دور ایک افسردہ مکاں میں سرد بستر پر
کوئی دل ہے کہ ہر آہٹ پہ یوں ہی چونک جاتا ہے
یہ رسم انقطاع عہدالفت ، یہ حیات تو
محبت رو رہی ہے اور تمدن مسکراتا ہے
یہ شادی خانہ آبادی ہو میرے محترم بھائی
مبارک کہہ نہیں سکتا مرا دل کانپ جاتا ہے

نظم ''کبھی کبھی'' ساحر کی بے حد مقبول اور خوبصورت رومانی نظم ہے۔ یہ نظم ساحر کی رومانی زندگی کی صداقت پر مبنی ہے۔ ان کی زندگی میں ایک بڑا خلا شریک حیات کا خلا ہے۔

نہ کوئی جاہ ، منزل نہ روشنی کا سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
انہی خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھوکر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس مگر یونہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

نظم ''ہراس'' میں ساحر کا مشاہدہ وتجربہ شک کی صورت میں نظر آتا ہے، جس سے شاعر خود کو بے چینی والجھن میں مبتلا پاتا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کی اداؤں کو محبت کے ترازو میں رکھے یا پھر حسن کی رنگین شرارت مان کر اس سے عشق کرنا چھوڑ دے۔

تیری سانسوں کی تھکن ، تیری نگاہوں کا سکوت
در حقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم ، وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

نظم ''متاع غیر'' میں بھی ساحر کا شک وشبہ برقرار ہے۔

تیرا انداز کرم ایک حقیقت ہے مگر
یہ حقیقت بھی ، حقیقت میں فسانہ ہی نہ ہو
تیری مانوس نگاہوں کا یہ محتاط پیام
دل کے خوں کرنے کا ایک اور بہانہ ہی نہ ہو

لیکن حقیقت کے آگے شک وشبہات کی کوئی بساط نہیں، اس لئے شاعر اپنے محبوب کو جلد ہی اس المیہ سے روبرو کراتا ہے جو اس پر خود گزر چکا ہے اور وہ المیہ یہ ہے کہ سرد راتوں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں اس کا ہر سانس گراں بار ہے۔ وہ اپنے محبوب سے پوچھتا ہے کہ اس کے مقدر کی تاریکی کبھی سحر میں تبدیل ہوگی یا نہیں اور جب کوئی جواب نہیں پاتا تو پھر نظم ''اسی دوراہے پر'' وجود میں آتی ہے اور شاعر عہد کرتا ہے۔

اب نہ ان اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا
میں نے اک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی
اور یہ عہد کیا تھا کہ بہ ایں حال تباہ
اب کبھی پیار بھرے گیت نہیں گاؤں گا
کوئی دروازہ کھلا بھی تو پلٹ آؤں گا
کسی چلمن نے پکارا بھی تو بڑھ جاؤں گا

مگر دل میں سلگتے ہوئے عشق کے شعلوں کی لویں جب شعور پر چھا جاتی ہیں تو ساحرؔ خود کو بہت مجبور پاتا ہے اور خود سے کیا ہوا عہد توڑ دیتا ہے۔ محبوب کی خاموش نگاہیں دیکھ کر پھر اک بار خود کو قربان کر دیتا ہے ؎

تری چپ چاپ نگاہوں کو سلگتے پا کر
مری بے زار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

شاعر کا محبوب سلگتی نگاہوں کو جس انداز و آہنگ میں صدا دیتا ہے، وہ لب ولہجہ اور انداز ''امرتا پریتم'' کے یہاں موجود ہے ؎

لکھ جا مری تقدیر کو میرے لئے
میں جی رہا ہوں تیرے بنا تیرے لئے
حرف میرے تڑپ اٹھتے ہیں اس طرح
سلگتے ہیں رات بھر یہ تارے جس طرح
سپنو کی ندیاں چیر کر آؤ ذرا
رات باقی بہت ہے نہ جاؤ ذرا

ساحرؔ نے بڑے بے باک انداز میں ایک جگہ وہ بات کہہ دی ہے جو ان کے محبوب کو کہنی چاہئے تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساحرؔ کی انانیت اور غیرت وشعور دل کے تقاضوں پر پوری طرح حاوی ہیں اور جس سے ساحرؔ کوئی سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتا ؎

تعارف روگ ہوجائے تو اس کا بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

ساحرؔ نے یہ نظم مشہور سنگر ''سدھا ملہوترا'' کے لئے کہی تھی۔ سدھا ملہوترا اور ساحرؔ کے عشق کے چرچے فلمی دنیا اور ادبی حلقوں میں بہت مشہور ہوئے۔ اخباروں نے بھی اس واقعہ کو سرخیوں میں رکھا، لیکن ساحرؔ کی محبت کا انجام یہ ہوا کہ سدھا ملہوترا کی کسی اور سے شادی ہوگئی اور ساحرؔ کے حصے میں پھر وہی تنہائی رہ گئی اور پھر جب شاعر کی محبوبہ نظم ''ایک ملاقات'' میں کسی اور کی ہوکر اس کے پاس آئی تو اس کی خاموشی دیکھ کر شاعر کا دل بے قرار ہوگیا۔ وہ اپنے محبوب کی پشیمان نظروں سے کہتا ہے ؎

کسی کی ہوکے تو اس طرح میرے گھر آئی
کہ جیسے پھر کبھی آئے تو گھر ملے نہ ملے
نظر اٹھائی ، مگر ایسی بے یقینی سے
کہ جس طرح کوئی پیش نظر ملے نہ ملے

ساحرؔ نے اپنی نظم ''پل دو پل'' میں ہی اپنی داخلی اور خارجی زندگی کے ہر پل کی کہانی بیان کردی ہے۔ عموماً شاعر خود کو عظیم اور شاعری کا امام سمجھتا ہے، لیکن ساحرؔ لدھیانوی نے بڑے ہی جرأت مندانہ انداز میں اس حقیقت کو عیاں کردیا ہے ؎

کل اور آئیں گے ، نغموں کی کھلتی کلیاں چننے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے تم سے بہتر سننے والے
کل کوئی مجھ کو یاد کرے ، کیوں کوئی مجھ کو یاد کرے
مصروف زمانہ میرے لئے کیوں وقت اپنا برباد کرے

ساحرؔ نے رومانی نظموں کے ساتھ ساتھ اپنے احتجاج کا بھی پرچم بلند کیا ہے۔ ہمارے سماج میں کسی ہندوستانی لڑکی کو اپنی مرضی سے اپنا شریک حیات منتخب کرنے کا حق نہیں اور اگر کوئی لڑکی یہ حوصلہ کرتی بھی ہے تو اسے سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہی تیاگ اور قربانی رومانیت کے اصل مفہوم کو روشن کرتی ہے اور اس کے عاشق کو سماج کا باغی سرکش اور کبھی کبھی ایک احتجاجی شاعر بھی بنا دیتی ہے اور آگے چل کر وہ تصوف وتقدس کے عناصر سے احتجاج کرنے لگتا ہے جیسا کہ ساحرؔ نے کیا ؎

میں تصوف کے مراحل کا نہیں ہوں قائل
میری تصویر پہ تم پھول چڑھاتی کیوں ہو؟
ایک سرکش سے محبت کی تمنا رکھ کر
خود کو آئین کے پھندوں میں پھنساتی کیوں ہو؟

میں سمجھتا ہوں تقدس کو تمدن کا فریب
تم رسومات کو ایمان بناتی کیوں ہو؟
تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کردو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

نظم ''تاج محل'' صرف تلخیاں ہی نہیں بلکہ ''کلیات ساحرؔ'' کی شاہکار نظم ہے جو ساحرؔ کے فکر وخیال کا نیا رخ پیش کرتی ہے۔ بقول خواجہ احمد عباس:

''یہ ایک نئی آواز تھی، ایک بے خوف اور نامانوس آواز''

تاج تیرے لئے اک مظہر الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادی رنگیں سے عقیدت ہی سہی
یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارہ ، یہ محل
یہ منقش در و دیوار یہ محراب یہ طاق
ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

ساحرؔ کو اپنے وطن سے بھی بے حد محبت تھی ۔ وہ ہمیشہ وطن میں امن پھیلانے کی بات کرتے اور اپنے قلم سے ملک کی حفاظت میں جنگ کے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ جنگ نہیں، بلکہ دنیا کے تمام مسئلے کو وہ محبت سے سلجھانا چاہتے تھے ۔

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتیاج کل دے گی

جہاں ساحرؔ نے رومانی احتجاجی نظمیں کہیں وہیں انہوں نے انقلابی نظمیں بھی کیا خوب کہی ہیں۔ سیاست کے خلاف انہوں نے اپنی نظم ''لہو نذر دے رہی ہے حیات'' میں اپنے ذہن کی انقلابی بیداری کو پروان چڑھایا ہے۔ یہ پوری نظم انقلاب زمانہ، رجائیت اور جذبات کی اثر آفرینی سے ساحرؔ کے پر جوش اور باغیانہ ذہن کا پتہ دیتی ہے ۔

قدم قدم پہ لہو نذر دے رہی ہے حیات
سپاہیوں سے الجھتے ہوئے چراغوں کو

مری صدا کو دبانا تو غیر ممکن نہیں
مگر حیات کی للکار ، کون روکے گا؟
فصیل آتش و آہن بہت بلند سہی
بدلتے وقت کی رفتار کون روکے گا؟
نئے خیال کی پرواز روکنے والو
نئے عوام کی تلوار کون روکے گا؟

ساحرؔ کی نظم '' جاگیر'' اور ''فنکار'' ان کی انقلابی اور بے مثال تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہے۔''فنکار'' میں شاعر کو مفلسی کے سبب چند ضروری اشیا کے لئے مجبور ہوکر اپنے فن کو بازار میں فروخت کرنا پڑتا ہے۔ شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہوکر کہہ رہا ہے ۔

دیکھ اس عرصہ گہہ محنت و سرمایہ میں
میرے نغمے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے
آج گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے

ساحرؔ نے اپنی انقلابی شاعری میں بھی امن وملت کے معیار کو بلند کیا اور محبت کے احساس کے دامن کو کہیں بھی نہیں چھوڑا ہے ۔

ہم امن چاہتے ہیں مگر ظلم کے خلاف
گر جنگ لازمی ہے تو پھر جنگ ہی سہی

ساحرؔ نے ترقی پسندی کو اشتراکیت سے زیادہ رومانیت کے قریب کیا اور یہی انفرادیت ساحرؔ کی پہچان بنانے میں مددگار ثابت ہوئی۔ ساحرؔ کی نظموں کے اشعار میں غزل کی خوبیاں جذب ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ساحرؔ کے نظموں کے اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ ساحرؔ کی کسی بھی نظم کے اشعار کہیں سے بھی نظم سے الگ کر کے پڑھے جائیں تو وہ اپنے آپ میں مکمل غزل کی شعریت کا مزا دیتے ہیں۔ یہی ساحرؔ کی شاعری کا وہ ذائقہ ہے جو ساحرؔ کو منفرد مقام دلاتا ہے۔

ساحرؔ نے نظم ''جشن غالبؔ'' میں زبان اردو کے غداروں کی سیاسی چالوں کو آئینہ دکھایا ہے، شاید یہ وہ کام ہے جو کوئی اور نہ کرسکا ۔

اکیس برس گزرے آزادی کامل کو
تب جاکے کہیں ہم کو غالبؔ کا خیال آیا

تربت ہے کہاں اس کی، مسکن تھا کہاں اس کا
اب اپنے سخن پرور ذہنوں میں سوال آیا
غالبؔ جسے کہتے ہیں، اردو ہی کا شاعر تھا
اردو پہ ستم ڈھا کر غالبؔ پہ کرم کیوں ہے

عورت کی عظمت اور محبوب کی شکل میں سارے رنج وغم اپنانے والی شخصیت جواخترؔ شیرانی سے فیضؔ اور سردار جعفری سے ہوتی ہوئی ساحرؔ کے یہاں پہنچتی ہے، وہ ہندوستانی روایات میں سمٹی ہوئی ایک لڑکی کی تصویر ہے، جو کہیں کسان کے گھر، کہیں درندوں میں جنم لینے والی خوبصورت دوشیزہ ہے تو کہیں مجبوریوں کے سبب ایک طوائف، مگر ان سب کا ذمہ دار ساحرؔ نے مرد کو ہی ٹھہرایا ہے ۔

نور سرمایہ سے ہے روئے تمدن کی جلا
ہم جہاں ہیں وہاں تہذیب نہیں پل سکتی
مفلسی حس لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

ساحرؔ نے صرف سرمایہ داری کو ہی اپنے احتجاج کا نشانہ نہیں بنایا بلکہ مغلیہ حکومت کو بھی نہیں بخشا اور نظم ''نور جہاں کے مزار پر'' بھی کچھ اس طرح افسوس ظاہر کیا ہے ۔

کیسے مغرور شہنشاہوں کی تسکیں کے لئے
سالہا سال حسیناؤں کے بازار لگے
کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیش کے لئے
سرخ محلوں میں جواں جسم کے انبار لگے

ساحرؔ کی شاعری جہاں ایک طرف ان کی زندگی کا آئینہ ہے وہیں دوسری طرف سماج کے ماحول کا درپن۔ ساحرؔ نے اپنی پوری زندگی غریبوں و بے بسوں کو سہارا دیتے ہوئے گزاری ہے۔ کیفیؔ اعظمی فرماتے ہیں کہ:

''میں نے زندگی میں وہ بھی گلیاں، جھوپڑیاں دیکھی ہیں جو کبھی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ساحرؔ ہیں کیوں کہ جب بھی کسی مشاعرے میں ہم دونوں کو جانے کی دعوت ملتی تو ساحرؔ مجھے لے کر آٹھ، دس گھنٹے پہلے ہی وہاں پہنچ جاتے اور وہاں کے غریب علاقوں میں، گلیوں میں خوب پیدل چلتے اور کسی غریب کو روتا ہوا دیکھ کر اس کے پاس جا کر اس کی وجہ ضرور پوچھتے اور اس کی مدد بھی کرتے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ساحرؔ مشاعرے میں پائی ہوئی رقم کو وہاں کے غریبوں کو ہی دے کر چلے آتے تھے۔''

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمام ادیب صرف اپنی تخلیق میں ہی غریبوں کے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ساحرؔ عملی طور پر غریبوں کے لئے سب کچھ کرتے نظر آتے ہیں۔

ساحرؔ کی ''تلخیاں'' کے بعد ایک مجموعہ ''پرچھائیاں'' منظر عام پر آیا۔ ساحرؔ نے تکلیفوں بھرا سفر طے کر لیا، مگر اپنے اصولوں سے کہیں سمجھوتہ نہیں کیا۔ چنانچہ وہ اپنی رومانی شاعری اس کے بعد فلمی گیتوں کے ذریعہ دنیائے ادب اور فلم میں بے پناہ مقبول ہوئے۔ مشاعروں کا تو یہ عالم تھا کہ بقول فراقؔ:

''آج بھی مشاعرے کے ٹکٹ ساحرؔ کے نام پر بکتے ہیں۔''

ان کے شعری مجموعہ ''تلخیاں'' کے جتنے ایڈیشن شائع ہوئے اس کا اپنا ایک ریکارڈ ہے۔ غیر معمولی شہرت ومقبولیت تو اپنے آپ بہت سے سوال کھڑے کر دیتی ہے، کچھ الزامات بھی اپنے ساتھ لے کر آتی ہے مثلاً ساحرؔ تو نوجوانوں کا شاعر ہے، ساحرؔ فلموں کا شاعر ہے، ساحرؔ عوامی شاعر ہے وغیرہ وغیرہ۔ ساحرؔ کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی صرف اُس کی نظموں کے طفیل نہیں تھی بلکہ اِس سدابہار مقبولیت کی وجہ اُس کی وہ شاعری تھی جو عشق سے شروع ہوتی ہے اور رومان پر ختم ہو جاتی ہے۔ بقول علی سردار جعفری:

''عشق میں بھی محبوب زیادہ رہا اور عاشق کم، اس کی اپنی ذات اور اپنی شاعری، اس کا سب سے محبوب موضوع سخن تھا۔''

تبھی تو ساحرؔ نے کہا ہے ۔

کون جانے یہ تیرا شاعر آشفتہ مزاج
کتنے مغرور خداؤں کا رقیب آج بھی ہے

❀❀❀

ڈاکٹر فائزہ احمد
Khanqah Bargah-e-Ishq, Takia Sharif, Meetan Ghat, Gurhatta, Patna 800008 (Mob. 7463879423)

ساحرؔ: پل دو پل کا شاعر

ادب کا ہر فنکار اپنے عہد کا نباض ہوتا ہے۔ وہ جس عہد میں جیتا ہے، سانس لیتا ہے، اس کا عمیق مشاہدہ کرتا ہے، چاہے وہ نثر نگار ہو یا شاعر، اس کا دل عام انسانوں سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے حادثات، سانحات اور واقعات سے متاثر ہوکر خود کو جذبات و محسوسات کی بھٹی میں تپا کر، لفظوں کے پیکر میں ڈھال کر انہیں عام انسانی زندگی کے سامنے پیش کرتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ بڑے بڑے ادبا و شعرا نے سماج میں پھیلی ہوئی فرسودگی، بے اعتدالی اور سیاسی انتشار کے خلاف آواز بلند کی اور اپنے قلم کی قوت سے حالات کو بدلنے کی کوشش کی، صرف ادب و شاعری کے اوراق ہی میں نہیں بلکہ سنیما کے پردوں پر بھی بے شمار ناولوں، ڈراموں، افسانوں کو اس انداز سے پیش کیا گیا کہ عوام اس سے متاثر ہوں اور ان کے ذہنوں کی آبیاری ہو سکے۔

یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ نثر کی بہ نسبت اس کام میں شاعری زیادہ پُر اثر ثابت ہوئی۔ وہ شعرا جنہوں نے یہ ذمہ داری قبول کی ان میں راجہ مہدی علی خاں، جاں نثار اخترؔ، مجروحؔ سلطان پوری اور شکیلؔ بدایونی کے شانہ بہ شانہ ایک معتبر نام ساحرؔ لدھیانوی کا بھی ہے جنہوں نے فلمی شاعری کو ادبیت دینے میں بہتوں سے بہتر رول نبھایا۔ انہیں جو مقبولیت، شہرت و عزت ملی وہ دوسروں کے حصے میں نہ آئی۔ ساحرؔ نے اپنے عہد کی نمائندگی کرنے کے ساتھ آنے والے مستقبل کے بہتیرے خواب بھی دیکھے جو ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے والوں سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔

آؤ کہ کوئی خواب بنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بن سکیں

ساحرؔ کی شاعری میں ایک طرف پھولوں کی نزاکت ہے تو دوسری طرف تلوار کی تیز دھار بھی ہے۔ ساحرؔ کی شاعرہ گواہ ہے کہ اس نے اپنے وقت کی بدلتی دنیا کا جائزہ لیا۔ بدلتی قدروں کو اور نئے طرز بان کو اپنایا اور اپنے کلام میں ایک اچھوتا پن دے کر فکر میں تازگی و دلکشی پیدا کی۔

ساحرؔ لدھیانوی بنیادی طور پر فلمی گیتوں کے شہنشاہ ہیں۔ انہوں نے فلموں کو بے شمار سدابہار نغمے دیئے جن کو سن کر آج بھی ہمارا دل جھوم اُٹھتا ہے اور ایک عجیب سے سرور میں ڈوب جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے گیتوں میں ادبی شان اور شاعرانہ وقار قائم رکھا۔

ساحرؔ لفظوں کے جادوگر ہیں ان کے الفاظ دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں اور روح میں جذب ہوجاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے گیتوں کے ذریعہ اردو شاعری کو بلندی عطا کی۔ وہ ان معدودے چند شعرا میں ہیں جنہیں فلمی دنیا میں بے پناہ محبت ملی۔ ساحرؔ نے اپنے معجزہ سخن سے تمام اردو ادب کو اپنا مرید کرلیا، ان کے لکھے اشعار نے فلمی دنیا میں زبردست ہلچل مچادی۔

مرے دل میں آج کیا ہے
تو کہے تو میں بتا دوں

(فلم: داغ)

ابھی نہ جاؤ چھوڑ کے کہ دل ابھی بھرا نہیں
تم اگر ساتھ دینے کا وعدہ کرو

(فلم: ہم دونوں)

میں یوں ہی مست نغمے لٹاتا رہوں
تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنا لے

(فلم: بازی)

انہوں نے فلمی گانے کے توسط سے اردو شاعری کے معیار کو بہت توانائی

بخشی۔ان کے گیتوں کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ ان میں عام زندگی کے استعاروں کا استعمال بڑے معنی خیز انداز میں کرتے ہیں۔ انہوں نے بڑے بڑے موسیقاروں کے ساتھ بڑی شان کے ساتھ کام کیا۔ان میں خیام، روی، نوشاد، این دتا، ایس ڈی برمن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔چند حوالے دیکھئے ۔

''ملتی ہے زندگی میں محبت کبھی کبھی''

(فلم: آنکھیں، روی کے ساتھ)

''نیلے گگن کے تلے، دھرتی کا پیار پلے''

(فلم: ہم راز)

اور این دتا کے ساتھ:

''میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی''

اس کے علاوہ انہوں نے خیام، جئے دیو کے لئے کئی آفاقی نغمے لکھے۔ ان کے نغموں میں کوہسار جیسا ٹھہراؤ اور پانی سی روانی ہے جس سے سننے والے یوں لطف اندوز ہوتے ہیں جیسے یہ اُن کی روح کی خواہش ہو، مثلاً ۔

مانگ کے ساتھ تمہارا، میں نے مانگ لیا سنسار

جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا
روکے زمانہ، چاہے روکے خدائی تم کو آنا پڑے گا

یہ دل تم بن کہیں لگتا نہیں ہم کیا کریں
تصور میں کوئی بستا نہیں ہم کیا کریں
تم ہی کہہ دو اے جانِ وفا ہم کیا کریں
کسی کے دل میں بس کے دل کو تڑپانا نہیں اچھا
نگاہوں کو جھلک دے دے کے چھپ جانا نہیں اچھا
امیدوں کے کھلے گلشن کو جھلسانا نہیں اچھا
ہمیں تم بن کوئی جچتا نہیں ہم کیا کریں
تم ہی کہہ دو اے جان وفا ہم کیا کریں

ساحؔر کے ایسے ہزاروں نغمے ہیں جو آج بھی ہندوپاک کی سرحدوں کے اندر اور اس کے پار بلاخوف چہل قدمی کرتے ہیں۔ان کے گیت میں عشق کی معصومیت اور زندگی کی حرارت پورے آب وتاب سے جلوہ گر نظر آتی ہے۔انہوں نے فلمی گانے کے ذریعہ اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے اور لطف یہ ہے کہ بس انسانی جذبات کا ایک چراغ نہیں جلایا بلکہ پوری اُردو شاعری کو روشن کردیا ہے۔انہوں نے اس دور میں شاعری کی جب اقبالؔ، جوشؔ، فیضؔ کی شاعری کا طوطی بولتا تھا۔ مجروؔح، مجازؔ جیسے ستارے اپنی آب وتاب سے چمک رہے تھے۔ایسے میں ان کی راہ بہت مشکل تھی، پھر بھی وہ خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔

ساحؔر کے لکھے نغمے دوسروں سے مختلف تھے کیونکہ انہوں نے گل وبلبل مئے ومینا، حسن وعاشقی جیسے موضوعات سے گریز کرتے ہوئے سماج کے دکھ درد کو موضوع بنایا اور سماج کے بگڑتے حالات، مادہ پرستی، سیاسی انتشار، جاگیردارانہ نظام کی بے حسی پر توجہ مرکوز کی۔اردو شاعری کو خاص کر فلمی دنیا کو ایک نیا فکری عنصر دیا جس نے آزادی کے بعد بہت دیر اور بہت دور تک نوجوانوں کے تخیل کو اپنی گرفت میں لئے رکھا ۔

سنسار کے ہر شئے کا اتنا ہی فسانہ ہے
اک دھند سے آنا ہے اک دھند میں جانا ہے

وہ صبح کبھی تو آئے گی
ان کالی صدیوں کے سر سے جب رات کا آنچل ڈھلکے گا
جب دکھ کے بادل پگھلیں گے، جب سکھ کا ساغر چھلکے گا
جب انبر جھوم کے ناچے گا، جب دھرتی نغمے گائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

ساحؔر کی شاعری کے آئینہ میں ایک طرف سماج کی کڑوی سچائی کا عکس اور کرب نظر آتا ہے تو دوسری طرف حالات سے مقابلہ کرنے کا عزم بھی دکھائی دیتا ہے۔وہ غم اور تکلیف سے فرار کے بجائے اس کا ہر طرح سے علاج تجویز کرتے ہیں اور زندگی کو خوشنما رنگ دینے کے دل وجان سے تمنائی نظر آتے ہیں ۔

میں زندگی کا ساتھ نبھاتا چلا گیا
ہر فکر کو دھوئیں میں اُڑاتا چلا گیا
بربادیوں کا سوگ منانا فضول تھا
بربادیوں کا جشن مناتا چلا گیا

فلم ''ہم دونوں'' کا یہ گانا سن کر دل جھوم جاتا ہے اور یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ساحؔر کے اندر نا اُمیدی، یاس، قنوطیت کے جذبات کبھی حاوی نہیں ہوئے بلکہ امید پرستی کے جذبات ہی ہمیشہ غالب رہے۔ بیشک ان کی شاعری میں زندگی ست رنگی روشنیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

ساحؔر کے نغمے مختلف رجحانات کے حامل ہیں اور ان کے شعری گلشن میں ہر طرح کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ چاہے وہ عشق کا اظہار ہو یا انتظار، وفا، جدائی یا حب الوطنی کا جذبہ ۔

یہ دیش ہے ویر جوانوں کا
البیلوں کا مستانوں کا

بابل کی دعائیں لیتی جا
جا تجھ کو سکھی سنسار ملے

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ساحؔر نے زندگی کے ہر پہلو کو اپنی شاعری، خصوصاً فلمی شاعری میں بہت ہی انفرادی رنگ سے پیش کیا ہے۔ وہ ایک بااثر اور باوقار شاعر تھے۔ انہوں نے ادب کی شاعری اور فلم کی شاعری کے فرق کو مٹا دیا اور اپنی خوبصورت اور پراثر خیالات سے لبریز شاعری پر عوام کا حق سمجھا۔

ساحؔر لدھیانوی کی شاعری سینکڑوں ہندی فلموں میں شامل ہے۔ ان میں گرودت کی فلم ''پیاسا'' اور یش راج کی ''کبھی کبھی'' بڑی شہرت رکھتی ہے۔ ''پیاسا'' کے گانے تو یقینی طور پر درجہ اوّل کی شاعری کے زمرے میں آتے ہیں ۔

یہ محلوں یہ تختوں یہ تاجوں کی دنیا
یہ انساں کے دُشمن سماجوں کی دنیا
یہ دولت کے بھوکے رواجوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

اور فلم ''کبھی کبھی'' کا یہ گانا تو ہمیشہ سدا بہار رہے گا ۔

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لئے

میں پل دو پل کا شاعر ہوں
پل دو پل مری کہانی ہے
پل دو پل میری ہستی ہے
پل دو پل مری جوانی ہے

بیشک پل دو پل کا شاعر ساحؔر لدھیانوی اپنے دل فریب نغموں کے ذریعہ ہمیشہ ہمارے دلوں میں بسا رہے گا اور اس کے لکھے نغمے ہمارے دلوں کو گرماتے اور برماتے رہیں گے۔ ❁❁

اقوالِ ساحؔر

- ☆ قاتل کو جو نہ ٹوکے، وہ قاتل کے ساتھ ہے
- ☆ حاصل زندگی خرد بھی ہے، حاصل زندگی جنوں ہی نہیں
- ☆ کشکول فن اُٹھا کے سوئے خسرواں نہ جا
- ☆ عشق ناکام سہی زندگی ناکام نہیں
- ☆ جواں ہوں میں جوانی لغزشوں کا ایک طوفاں ہے
- ☆ کون کہتا ہے کہ آہیں ہیں مصائب کا علاج
- ☆ ہزار برق گرے، لاکھ آندھیاں اُٹھے وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں
- ☆ مکافات عمل، تاریخ انساں کی روایت ہے
- ☆ خون خود دیتا ہے جلادوں کے مسکن کا سراغ
- ☆ جس میں خلوصِ فکر نہ ہو وہ سخن فضول
- ☆ زیست احساس بھی ہے، شوق بھی ہے، درد بھی ہے
- ☆ جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
- ☆ زندگی پیاری سہی لیکن ہمیں مرنا تو ہے
- ☆ سفر ہے شرط، شریک سفر ملے نہ ملے
- ☆ تعلق بوجھ بن جائے تو اُس کو توڑنا اچھا
- ☆ طلوع صبح سے تاروں کی موت ہوتی ہے
- ☆ بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی
- ☆ مفلسی حس لطافت کو مٹا دیتی ہے
- ☆ فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

(سبھی اقوال ساحؔر کے مصرعوں سے ماخوذ)

نتن پربھاکر مہاجن
Mogul Lane, Mahim, Mumbai - 400016

سب سے اونچا ساؔحر تیرا نام رہے

نکلی ہے بات شاعروں کی
تو میں بھی کچھ عرض کرتا ہوں
جادوگر تھے جو لفظوں کے
جی میں ساؔحر کی بات کرتا ہوں

''یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے''، پوچھا کبھی
تو کبھی ''فکر کو دھوئیں میں اُڑانے'' کی بات کی
''پھر سے اجنبی ہو جانے'' کی التجا کرتے کرتے
غموں کے دور میں مسکرانے کی بات کی

شاعری آپ کی
ہر جذبے ہر احساس کی تصویر ہے
زمانہ گواہ ہے
ان اشعار میں کتنی تاثیر ہے

طویل ہے فہرست نغموں کی
ہر گیت لاجواب ہے
ہر شعر کہتا کوئی حقیقت
لفظوں کا ماہر انتخاب ہے

افکار آپ کی شاعری میں
یوں منظّم ہو جاتے ہیں
ملتا ہے وجود لفظوں کو
سارے حرف محرم ہو جاتے ہیں

وہ طلسم آپ کی شاعری کا
اب شئے مفقود ہے
اب وہ گہرائی کہاں کسی شاعر میں
بس سوچ میں خلا موجود ہے

غالبؔ، میرؔ و ذوقؔ کی وراثت کو
چلایا تو نے ساؔحر
تیرے ہی فیضؔ سے
نورِ شاعری ہے ظاہر

حلاوتِ اردو زباں سے واقف بنایا آپ نے
مشکور ہوں آپ کا اس پتھر کو ثاقب بنایا آپ نے
کرتا ہوں دعا اردو کی نوا تا قیامت قائم رہے
شاعروں کے کہکشاں میں، سب سے اونچا ساؔحر تیرا نام رہے

(شعری مجموعہ ''افکار'' مطبوعہ قاسمی پرنٹرس، ممبئی ص ۱۶ سے ماخوذ)

مقالات

سید محمد نیر رضوی
Flat No.C-3- Rahman Apartment, New paras Toli, Doranda, Ranchi - 834002 (Mob. 8987582814)

خواجہ حسن نظامی: پھلواری شریف پٹنہ میں

خواجہ حسن نظامی، حضرت سید شاہ بدرالدین قادری قدس سرہٗ، زیب سجادہ، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ کے خلیفہ تھے۔ اُنہوں نے اپنے مرشد سے باطنی تعلیمات کے ساتھ ساتھ مختلف سلاسل کی اجازت و خلافت بھی حاصل کی تھی۔ خواجہ حسن نظامی کے اجداد مہاراجہ پرتھوی راج چوہان کے عہد میں بخارا سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور یہاں دہلی میں مقیم ہو گئے۔ خواجہ حسن نظامی کا نسبی تعلق محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا کی ننیہال میں ایک صاحب تصنیف بزرگ خواجہ سید بدرالدین اسحاق تک ۱۳ واسطوں میں پہنچتا ہے جو بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کے دست گرفتہ تھے اور داماد بھی تھے۔

خواجہ صاحب کی پیدائش دسمبر ۱۸۷۸ء کو دہلی میں ہوئی۔

خواجہ حسن نظامی نے ناظرہ قرآن شریف اور عربی و فارسی کی چند کتابیں، اپنے والد سید عاشق علی نظامی سے پڑھی۔ اُن کے والد حافظ قرآن بزرگ تھے۔ خواجہ حسن نظامی کے اُستادوں میں مولانا اسمٰعیل کاندھلوی، مولانا میاں کاندھلوی، مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی، مولوی وصیت علی، مولوی عبدالعلی محدث دہلوی، مولوی حکیم الدین پنجابی، مولوی حکیم رضی الحسن کاندھلوی، حضرت شیخ غلام نظام الدین صاحب خاکسار اور سید نذیر حسن محدث دہلوی وغیرہ کے نام نامی قابل ذکر ہیں۔ خواجہ نے مولانا رشید احمد صاحب کے مدرسہ گنگوہ میں بھی تعلیم حاصل کی۔ خواجہ حسن

نظامی کی پہلی شادی اُن کے چچا سید معشوق علی نظامی کی دختر نیک اختر سیدہ حبیب بانو سے ہوئی، اُن سے اولاد بھی ہوئی، مگر سب فوت ہو گئی پھر اہلیہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ دوسری شادی ۱۹۱۶ء میں سیدہ محمودہ خواجہ بانو سے ہوئی۔ اُن سے پانچ بیٹے سید حسین نظامی، سید علی نظامی، سید زید پاشا نظامی، سید حسن ثانی نظامی، سید مہدی نظامی اور دو بیٹیاں سیدہ روح بانو اور سیدہ کوثر بانو ہوئیں۔

خواجہ حسن نظامی کا نام اُن کے والدین نے قاسم علی رکھا تھا، مگر اُن کے ماموں اُنہیں ''علی حسن'' کہہ کر پکارتے تھے۔ شروع میں آپ کے مضامین سید محمد علی نظامی کے نام سے چھپتے رہے، بعد میں جب ''وکیل'' امرتسر میں ''حلت زاغ'' اور ''انڈیا گزٹ'' بمبئی میں ''انڈیا کی نازک حالت'' کے زیر عنوان مضامین شائع ہوئے تو اُس پر آپ کا نام خواجہ حسن نظامی ہی چھپا ہوا تھا۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی نے علامہ اقبالؔ کی خواہش پر اپنا یہی نام منتخب کر لیا جسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

خواجہ حسن نظامی بنیادی طور پر صوفی تھے اور تصوف کی ترویج و اشاعت اُن کا اہم نصب العین تھا۔ خواجہ صاحب کے مشیروں نے اُن کی حوصلہ افزائی کی۔ قلم نے زور پکڑا، پھر اُن کے مضامین ''پیسہ اخبار'' لاہور ''وکیل'' امرتسر، عبدالقادر کے رسالہ ''مخزن'' اور پنڈی بہاء الدین کے رسالہ ''صوفی'' میں مسلسل شائع ہونے لگے۔ خواجہ صاحب کی پہلی تصنیف بعنوان ''مفلسی کا مجرب علاج'' منظر عام پر آئی جو دراصل جلال الدین سیوطی کے ایک عربی رسالہ کا ترجمہ ہے جس میں مفلسی کے خاتمہ کے سلسلہ میں دعائیں اور اعمال وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے جب ہوش سنبھالا، وہ زمانہ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد کی پر آشوب صورت حال کا زمانہ تھا جہاں ہندوستانی سماج خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا اور انگریزی تہذیب کی برتری کا تصور مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔ غرض ایک تہذیب اور ایک معاشرت ختم ہو رہی تھی اور ایک دوسری تہذیب اور دوسرے طرز کی معاشرت جنم لے رہی تھی۔ اس ذہنی کشاکش اور تصادم میں خواجہ حسن نظامی کو

زندگی کے سنگین حقائق کا سامنا کرنا پڑا۔ ملت اسلامیہ بھی ذہنی انتشار کا شکار تھی اور سیکڑوں مسائل سے نبرد آزما ہو رہی تھی۔ ان مسائل کے حل کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے ایک طرف سرسید اور اُن کے ہم نوا مغربی تہذیب کا بہت حد تک استقبال کر رہے تھے جب کہ دوسری جانب اکبر اور اُن کے ہم نوا مغربی تہذیب سے بیزار نظر آ رہے تھے۔ صوفی مشرب خواجہ حسن نظامی کو ان مسائل کا مناسب، موزوں اور معتدل حل اُن کے متصوفانہ خیالات و نظریات میں نظر آ رہا تھا، چنانچہ خواجہ حسن نظامی نے جب خامہ فرسائی شروع کی اور خود کو ایک صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز مصنف، ایک معتبر صحافی، ایک عظیم روزنامچہ نگار، ایک بہترین قصہ نویس، ایک قابل احترام تذکرہ نگار، ایک خوش اسلوب خاکہ نگار، ایک منفرد کالم نویس، ایک مستند سوانح نگار و مورخ اور ایک مشہور انشائیہ نگار کے طور پر، پیش کیا تو آپ کی تمام تر تحریروں میں تخلیق کا سفر بالعموم تصوف سے شروع ہو کر تصوف ہی پر ختم ہوتا نظر آتا ہے۔

خواجہ صاحب اپنی تحریری اور تخلیقی صلاحیتوں اور اپنی قابل قدر خدمات کی بنا پر ''مصور فطرت'' اور ''شمس العلما'' جیسے القاب سے نوازے گئے۔ ''بلاوا''، ''تاریخ اولیا''، ''جاں باز مسلم''، ''حیدر آباد کے ڈگری یافتہ''، ''دہلی کا زیارت نامہ''، ''سری کرشن بیتی''، ''غالب کا روزنامچہ''، ''غزنوی جہاد'' اور ''سی پارۂ دل'' وغیرہ اُن کی شہرہ آفاق کتابیں ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کا مجموعہ ''سی پارۂ دل'' سے ایک اقتباس دیکھئے:

> '' آہاہا۔ وہ دیکھو، شیام سندر مرلی لئے بن سے نکلے، وہ ہمارے سینا پتی، تیر کمان سنبھالے نمودار ہوئے اب کوئی دم میں مرلیا باجے گی اور نین کی بدلی برسے گی۔ ندی نالے سوکھے تھے۔ گھٹ کے تیرتھ سونے تھے بھگتی گا تھا کال پڑا۔ ست کے گلے جنجال پڑا۔ اب مرگ کی ترشنا دور ہوئی اور چتا من کی کافور ہوئی، اب ہر ہر کی آمد آمد ہے۔ سنسار کا داتا آتا ہے اور ہر کا جھنڈا لاتا ہے۔''
>
> (مدنی شیام سندر کی مرلی)

اسی طرح خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے سے یہ ایک اقتباس دیکھئے:

> ''ایک دن ایک طوائف جو نعت گانے میں مشہور ہے، میرے ہاں بیٹھی تھی کہ ایک غیر مقلد مولانا صاحب تشریف لے آئے اور طوائف کو دیکھ کر اُنہوں نے زور سے لاحول پڑھی، طوائف کو اپنے گناہوں کا احساس ہوا، وہ رو پڑی۔ مجھ پر اُس کے رونے سے وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں نے کہا۔ اری سن! میرا اور تیرا تو ایک حال ہے۔ تو بھی لوگوں کو لوٹنے کے لئے بناوٹی کپڑے اور زیور پہن کر فریب کی شکل بناتی ہے اور میں بھی پرہیزگار مشہور ہونے کے لئے داڑھی اور سر کے بال بڑھاتا ہوں اور لمبا کرتا پہنتا ہوں۔ تو بھی محفل میں ناچتی ہے میں بھی قوالی میں رقص کرتا ہوں، مگر تو روتی ہے کیونکہ تجھے اپنے گناہوں کا احساس ہے اور میری آنکھ میں آنسو نہیں آتا کہ میں اپنی ریاکاری سے غافل ہوں۔''

خواجہ حسن نظامی کے عظیم کارناموں میں چند اہم کارنامے یہ ہیں کہ اُنہوں نے پہلی مرتبہ ہندی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ اور تفسیر پیش کیا۔ اُردو ادب میں ''روزنامچہ'' اور ''قلمی چہرے'' کو فن کا درجہ عطا کیا۔

خواجہ صاحب کا اسلوب نثار احمد فاروقی کے مطابق ''میر امن کی ترقی یافتہ صورت ہے'' مگر وہ اس ضمن میں پہلے اُردو ادیب ہیں جن کا اسلوب اپنی سادگی، رواں دواں اور عوامی ہونے کی بدولت، بیانیہ نثر میں تاثراتی ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ہر ہر لفظ دلنشیں ثابت ہو رہا ہے۔ یہی خواجہ صاحب کے اسلوب کا حسن ہے جس میں یہ راز پوشیدہ ہے کہ وہ ہر شئے میں تصوف کا کوئی نہ کوئی نکتہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی مفکر اسلام تھے، وہ قوم کے مصلح تھے، ملک و قوم کی ترقی کے لئے اُن کا اضطراب ہی صفحۂ قرطاس کی زینت بنا اور یہی فکر و فن، یہی اکتساب اصلاح، یہی انداز نظر، یہی انداز بیاں اور یہی نقطۂ نظر اُن کی شخصیت کا آئینہ دار ہے جو شاید اُن کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔

خواجہ صاحب اُن کی ادبی، علمی اور اصلاحی سرگرمیوں کا محور بطور خاص ''تصوف'' ہی تھا۔ اُن کی چالیس سے زیادہ تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ہند و پاک کے مختلف باذوق مصنفین اور محققین خواجہ حسن نظامی کی حیات و خدمات اور دیگر متعلقہ علوم و فنون پر مسلسل تحقیقی

کام کررہے ہیں اوراس ضمن میں اب تک کئی اچھی اور قابل قدر تصانیف بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔ راقم الحروف نے بھی خواجہ حسن نظامی کی علمی اورادبی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ایک کتاب بعنوان ''خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری: ایک تجزیاتی مطالعہ'' تحریر کیا ہے جو قومی کونسل برائے فروغ اُردوزبان، نئی دہلی کے تعاون سے منظر عام پر آچکی ہے اور جسے اہل نظر نے بنظر استحسان دیکھا ہے۔ خواجہ شناسی کا یہ سلسلہ ابھی بھی بدستور جاری ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے بیعت طریقت کا قصہ نہایت دلچسپ، دلکش اور دل پذیر ہے۔ خواجہ صاحب کے والد نے محض گیارہ برس کی عمر میں حضرت شاہ اللہ بخش تونسوی کے دست حق پرست پر اُن کی بیعت کرا دی، مگر حضرت بہت جلد رحلت فرما گئے، پھر بارہ برس کی عمر میں والد صاحب کا بھی انتقال ہوگیا، پھر خواجہ صاحب کے بڑے بھائی نے پنجاب کے ایک مشہور بزرگ حضرت خواجہ غلام فرید سے اُن کی بیعت کرادی۔ افسوس یہ کہ اُن کا بھی جلد ہی وصال ہوگیا۔ اب خواجہ حسن نظامی نے ۲۴ سال کی عمر میں خود ہی اپنی سوجھ بوجھ، مشاہدہ اور باطنی تقاضوں کے پیش نظر حضرت پیر سید مہر علی شاہ چشتی نظامی، سجادہ نشیں، گولڑہ شریف، راولپنڈی سے بیعت کی اور پیر مہر علی سے اجازت و خلافت حاصل کی، مگر راہ سلوک کے اس بے چین قلب مسافر کو چین نہیں تھا، تشنگی ابھی باقی تھی، چنانچہ خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۱۱ء میں ہندوستان کی مشہور فیض رساں خانقاہ، خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، بہار کے علاوہ ہندوستان کے دیگر مقامات کے ساتھ ساتھ مصر، فلسطین، شام، حجاز، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا سفر کیا۔ اس سفر کے دوران، اُن کی زندگی میں تین اہم واقعات پیش آئے جس نے اُن کے قلب مضطرب کو سکون بخشا اور دل نے گواہی دی کہ شاید یہی صراط مستقیم ہو۔ مکہ مکرمہ میں مشہور شاذلی بزرگ حضرت شیخ محمد ابراہیم الشاذلی نے سلسلہ شاذلیہ کی اجازت و خلافت عطا کی۔ مدینہ منورہ میں حضرت شیخ محمد حمزہ رفاعی، مہتمم مسجد روضہ نبوی نے سلسلہ رفاعیہ کی اجازت وخلافت عطا کی۔ پھلواری شریف میں فیاض المسلمین حضرت شاہ بدر الدین قادری، سجادہ نشین، خانقاہ مجیبیہ نے سلسلہ قادریہ اور دیگر سلاسل کی اجازت و خلافت عطا کی۔

خواجہ صاحب کو سب سے زیادہ سلاسل کی اجازت خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف سے ہی عطا ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی کے صاحب زادہ خواجہ حسن ثانی نظامی مرحوم کے مطابق حضرت سید شاہ بدر الدین قادری سے جن سلاسل کی اجازت وخلافت ملی تھی وہ اس طرح ہیں:

''سلسلہ چشتیہ نظامیہ سراجیہ، سلسلہ قادریہ وارثیہ قمیصیہ، سلسلہ قادریہ عمادیہ، سلسلہ قادریہ جنیدیہ عمادیہ، سلسلہ قادریہ معزیہ، سلسلہ قادریہ شمسیہ، سلسلہ عالیہ چشتیہ عمادیہ خضریہ نسبت کے ساتھ، چشتیہ اشرفیہ مجیبیہ (حضرت پیر مجیب اللہ قادری کو روحانی اجازت حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سے ملی تھی)، سلسلہ چشتیہ صابریہ، سلسلہ عالیہ سہروردیہ مجیبیہ عمادیہ نسبت کے ساتھ، سلسلہ عالیہ قلندریہ مداریہ مغربیہ، سلسلہ عالیہ نقشبندیہ ابوالعلائیہ، سلسلہ عالیہ امامیہ، سلسلہ عالیہ احمدیہ بدویہ، سلسلہ شاذلیہ، سلسلہ اویسیہ وارثیہ نبویہ اول، سلسلہ اویسیہ وارثیہ دوم، نسبت اویسیہ وارثیہ سوم، سلسلہ اویسیہ جنیدیہ اور سلسلہ اویسیہ احمدیہ۔''

خواجہ حسن نظامی اب در دولت خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف سے وابستہ ہوئے۔ خانقاہ مجیبیہ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ یہاں اکثر و بیشتر حاضری دیتے رہے، مشق سلوک کرتے رہے اور فیضیاب ہوکر راہ سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے۔ اس طرح شمس العلما خواجہ حسن نظامی کی روحانی تربیت خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف میں ہوئی۔ راقم الحروف کے والد محترم، سید نسیم قادری مجھ حقیر سے فرماتے تھے کہ اُن کے والد (یعنی راقم الحروف کے دادا حضور) صاحب ''اعیان وطن''، حکیم سید شاہ شعیب رضوی نیرؔ، اُن سے فرماتے تھے کہ جب کبھی خواجہ حسن نظامی پھلواری شریف لاتے تو فیاض المسلمین خلوت میں اُنہیں طلب فرماتے۔ خواجہ صاحب پہلے قدم بوس ہوتے پھر قرآن و حدیث، عشق الٰہی اور عشق

مصطفٰی، شریعت وطریقت، مشق سلوک، تکمیل باطن، رشد و ہدایت، ورع وتقوع اور تصوف کے دیگر نکات پر تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع ہوتا اور بڑی عالمانہ گفتگو ہوتی۔ حالات حاضرہ پر تبصرہ اور سیاست جیسے موضوعات بھی زیر بحث آتے مگر وہ سب سے آخر میں آتے۔ حکیم شعیب رضوی نیر اُن عالمانہ اور عارفانہ مکالمات کو ذہن نشیں کرتے جاتے۔

خواجہ حسن نظامی کے رخصت ہونے کے بعد حکیم شعیب رضوی نیؔر خلوت میں پھر کسی مناسب وقت میں دوبارا طلب کئے جاتے اور اُن تمام بیانیہ، گفتگو یا مکالمات کو فیاض المسلمین کے سامنے اُسی انداز سے ادا کرتے جس طرح خواجہ حسن نظامی نے بیان کیا تھا تاکہ فیاض المسلمین کے لئے افہام وتفہیم میں آسانی ہو سکے۔ ہمارے والد سید نسیم قادری فرماتے تھے کہ اُن کے والد حکیم سید شاہ شعیب رضوی نیؔر، فیاض المسلمین حضرت شاہ بدرالدین قادری کے دست گرفتہ تھے، برادر نسبتی تھے اور بہت چہیتے مریدوں میں سے تھے جن کی یادداشت بہت اچھی تھی۔

خواجہ حسن نظامی نے کئی اخبارات و رسائل مثلاً ''نظام المشائخ''، ''تبلیغ نسواں''، ''اسکول گزٹ''، ''توحید''، ''پیر بھائی''، ''رعیت'' اور ''درویش'' کی ادارت کی۔ اُنہوں نے ''عادل''، ''آزاد''، ''حریت''، ''مولوی''، ''پیشوا''، ''آستانہ''، ''جنگ''، ''مرشد'' اور ''دین دنیا'' وغیرہ اخبارات ورسائل کی سرپرستی کی۔ اُن کا ایک اخبار ''منادی'' کافی مقبول اور ہردلعزیز ہوا۔ اسی رسالہ ''منادی'' کا حوالہ دیتے ہوئے جناب افتخار فریدی مرادآبادی نے ''صحیفہ امان'' میں لکھا ہے کہ:

> ''اب سے تقریباً ۵۵ سال قبل خواجہ حسن نظامی دہلوی نے 'منادی' اخبار کے اپنے روزنامچہ میں پھلواری شریف حاضری کا حال تحریر کیا تھا کہ اس خانقاہ کے شیخ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر کس اہتمام کے ساتھ چلتے آرہے ہیں۔ کئی سو سال گزر جانے کے باوجود خانقاہ کے معمولات زندگی گزارنے کے طریق میں کوئی تغیر نہیں ہوسکا ہے۔ اس خانقاہ کے شیخ خانقاہ میں معتکف رہتے ہیں، صرف نماز اور مزارات پر حاضری دیتے ہیں، حج یا جہاد کے لئے صرف باہر جانے کی اجازت ہے، جس حجرے میں قیام رہتا ہے اس میں ایک تختہ داہنی طرف رکھا ہوا ہے جس پر وفات کے بعد ہر شیخ کو غسل دیا جاتا ہے۔ ہر شیخ کا تکیہ ان کی وفات کے بعد حجرہ میں جہاں شیخ تشریف فرما رہتے ہیں، ان کی پشت کی طرف وہ تکیے سب جمع ہوجاتے ہیں اسے پڑھ کر پھلواری شریف حاضری کا شوق پیدا ہوا۔''

خواجہ حسن نظامی نے حضرت سید شاہ سلیمان پھلواروی اور دیگر ہم مشرب علما کے ساتھ مل کر ''حلقہ نظام المشائخ'' قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ نام نہاد صوفیوں کی بے راہ روی کو دور کیا جائے اور درگاہوں کی اصلاح کی جائے۔ اسی ''حلقہ نظام المشائخ'' سے ایک رسالہ ''نظام المشائخ'' کے نام سے نکلنا شروع ہوا۔ خواجہ حسن نظامی نے جب ''نظام المشائخ'' کا ''رسول نمبر'' نکالنے کا ارادہ کیا تو فیاض المسلمین بدرالکاملین حضرت سید شاہ بدرالدین قادری زیب سجادہ، خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ، صوبہ بہار سے خصوصی تحریر کی درخواست کی، چنانچہ فیاض المسلمین نے خواجہ حسن نظامی کی فرمائش پر ''لمعات بدریہ'' تحریر کیا۔ ''لمعات بدریہ'' حصہ اول میں تین مضامین ہیں۔ پہلا مضمون ''آثار رسول'' جو رسول اکرم سے وابستہ تبرکات کی فضیلت وبرکت پر مشتمل ہے۔ بتیس صفحات پر مشتمل اس طویل مضمون کا عنوان ہے: "ذریعة النجاة لمن تبرك بآثار سيد الكائنات" یہی وہ مضمون ہے جو ''نظام المشائخ'' میں شائع ہوا تھا اور جسے محبان اہل بیت نے بہت پسند فرمایا تھا۔ یہ مضمون نہایت ہی کارآمد اور معلوماتی ہے جو حلقہ اہل تسنن اور حلقہ اہل تشیع میں کافی مقبول ہوا۔

خواجہ حسن نظامی اور اُن کے اہل بیت کی پھلواری شریف سے بس یہ عقیدت ہی تھی اور قلبی تعلق ہی تھا کہ خواجہ حسین بن حسن نظامی نے سالنامہ ''منادی'' ۱۳۶۵ھ میں حضرت مولانا قاری سید شاہ حسین میاں قادری چشتی پھلواروی کی شخصیت پر ایک مختصر بیانیہ اُن کی شبیہ کے ساتھ شائع کیا۔ اس بیانیہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''حضرت مولانا قاری سید شاہ حسین میاں قادری چشتی پھلواروی حضرت قبلہ مولانا قاری سید شاہ محمد سلیمان قادری چشتی پھلواروی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادہ اور جانشین۔ وطن اور مولد و منشا پھلواری شریف، ضلع

پٹنہ، صوبہ بہار۔ آپ کا خاندان عہد ماضی سے برابر علوم مشرقی اور تصوف کا گہوارہ رہا ہے۔ آپ کے والد محترم کو تمام دنیائے اسلام میں شہرت حاصل ہوئی۔ نسب سید۔ آبائی سلسلہ مخدوم سید تاج فقیہ منیری سے ملتا ہے۔ نسب مادری زینبی جعفری ہے۔ حسب ذیل بزرگوں کی جزئیت بھی مختلف ذرائع سے پہنچی ہے۔ حضرت سیدنا غوث اعظم، شیخ الاسلام بابا فرید گنج شکر، مخدوم حسام الدین چشتی مانکپوری، مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاری، خلیفہ ہارون الرشید عباسی کی بھی جزئیت پہنچی ہے۔ تاریخ ولادت ۱۱ ربیع الثانی روز جمعہ ۱۳۱۲ھ عمر ۴۲ سال۔ علوم عربیہ دارالعلوم ندوۃ العلما میں اور گھر پر حاصل کئے۔ انگریزی تعلیم بی این کالج پٹنہ میں پائی۔ ۱۹۲۰ء میں عراق کا سفر کیا، جہاں حضرت پیر سید عبد الرحمٰن نقیب الاشراف و وزیر اعظم حکومت عراق علیہ الرحمۃ کے مہمان ہوئے۔ نجف اشرف کربلائے معلیٰ، بغداد شریف، سامرہ، بصرہ و کاظمین شریفین و دیگر اماکن مقدسہ کی زیارت سے فارغ ہو کر وطن آئے، پھر ۱۹۲۳ء میں حرمین شریفین کا سفر کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ جادو بیان مقرر ہیں۔ قرأت و خوش الحانی جن کا آبائی ورثہ ہے۔ بیان سیرت و ذکر میلاد میں غیر معمولی شہرت رکھتے۔''

خواجہ حسن نظامی اور اُن کے اہل خانہ کا قلبی تعلق پھلواری شریف سے مسلسل مستحکم ہوتا رہا۔ حضرت سید شاہ بدرالدین قادری کے وصال کے بعد اُن کے بڑے صاحب زادہ محی الملت حضرت سید شاہ محی الدین قادری خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف کے سجادہ نشیں ہوئے۔ وہ ایک صاحب وجد و سماع بزرگ تھے اور مجاہدات و ریاضات میں بڑے سخت تھے۔ خواجہ حسن نظامی کی عقیدت آپ کے عہد جانشینی میں بھی اُسی طرح برقرار رہی۔ حضرت سید شاہ محی الدین قادری نے بھی اپنے والد حضرت سید شاہ بدرالدین قادری کے نقش قدم پر خواجہ حسن نظامی اور اُن کے اہل خانہ کی روحانی تربیت کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ حضرت شاہ عون احمد قادری قدس سرہ اپنی کتاب سوانح محی الملۃ و الدین (۱۲۹۶ھ–۱۳۶۶ھ) میں اس ضمن میں ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں جو اس طرح ہے:

''شمس العلما خواجہ حسن نظامی (آستانہ محبوب الٰہی، دہلی) سے حضرت کے بہت پرانے مراسم تھے۔ پھلواری میں اُن کی آمد و رفت مولانا شاہ سلیمان صاحب علیہ الرحمۃ کے یہاں بہت قبل سے تھی، پھر حضرت اقدس مولانا شاہ محمد بدرالدین قادری پھلواروی کے پاس اُن کا آنا جانا ہوا۔ ان سے خواجہ صاحب کو اتنا خلوص و ارادت پیدا ہوئی کہ ان سے باطنی تعلیمات بھی حاصل کیا اور اُن کے سلاسل کی اجازتیں بھی لیں۔ ہمارے حضرت کے ساتھ بھی اُن کے خلوص و محبت کا یہی حال تھا۔ اکثر تشریف لایا کرتے اور دو ایک بار تو اپنے اہل و عیال کے ساتھ آئے۔ خواجہ صاحب کی درخواست پر حضرت نے اپنی ایک دستار تاج کے ساتھ عنایت فرمائی تھی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ یہ دستار نظامی ہے۔ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا اس وضع کی دستار زیب سر فرماتے تھے۔ سلسلہ چشتیہ کے ایک بزرگ حضرت شاہ معزالدین کرجوی کے واسطے سے اس خاندان میں یہ حضرت تاج العارفین قدس سرہ کو پہنچی ہے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے اپنی نظامی نسبت و جزئیت کی وجہ سے تمنا کی کہ ایک دستار مجھے بھی عنایت ہوتی۔ حضرت نے اُن کی درخواست قبول فرمائی اور اپنے منجھلے بھائی عمی و مرشدی مولانا شاہ قمر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب کہ وہ دہلی تشریف لے جا رہے تھے، یہ کہہ کر عنایت فرمائی کہ پہلے اس کو خود پہن لینا پھر خواجہ صاحب کو اپنے ہاتھ سے پہنا دینا۔ چنانچہ عمی و مرشدی مولانا شاہ قمر الدین صاحب رحمہ اللہ نے حسب ہدایت ملاقات کے وقت وہ دستار خود پہن لی پھر سر سے اُتار کر

خواجہ صاحب کو پہنادی۔‘‘ (ص ۱۸۵ ص ۱۸۶)
عصر جدید کے مشہور مورخ و محقق حضرت شاہ ہلال قادری نے ایک موقع پر دوران گفتگو مجھ سے عرض کیا تھا کہ حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی مرحوم نے اُنہیں اس دستار مبارک کی زیارت کرائی تھی۔

حضرت سید شاہ محی الدین قادری قدس سرہ نے ایک موقع پر خواجہ صاحب کو جو خط ارسال کیا ہے اُس سے خواجہ حسن نظامی کے ساتھ حضرت کے قلبی تعلق کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ خط طویل ہے، الہٰذا اس خط کا صرف پہلا اور آخری اقتباس پیش خدمت ہے:

’’بنام خواجہ حسن نظامی صاحب......

ہدیہ سلام تحیتہ الا سلام مع الاکرام پذیرفتہ باد......

پہلے کارڈ ارسال کر چکا ہوں اور شاہ حسین میاں سلمہ اللہ کا خط بھی خدمت گرامی میں پہنچ چکا ہے جو نوٹس شائع ہوئی اور گزٹ میں جو نقشہ بنا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ پورا قصبہ پیمائش میں آچکا ہے۔ اگر یہ تحریک نا مناسب ہوتو کم از کم اس قصبہ کو بچانے کی کوشش ضرور کریں۔ اللہ پاک آپ لوگوں کی سعی کو مشکور کرے۔ آمین۔ بعزیزان دعائے خیرباد! سلام مع الاکرام‘‘

محمد محی الدین قادری پھلواروی

۳۰ شوال پنجشنبہ ۱۳۶۳ھ

خواجہ حسن نظامی کے پھلواری شریف آنے کا سلسلہ حضرت شاہ محی الدین قادری کے عہد جانشینی میں بھی اُن کے وقت آخر تک جاری رہا جب کہ وہ خود بھی کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ شاہ عون احمد قادری اپنی کتاب ’’سوانح محی الملۃ و الدین (۱۲۹۶ھ-۱۳۶۶ھ)‘‘ میں فرماتے ہیں کہ:

’’ایک مرتبہ خدمت اقدس میں حاضر تھا، خواجہ حسن نظامی تشریف لائے۔ اس زمانہ میں حضرت کی صحت بہت خراب تھی۔ نقل وحرکت دشوار ہو رہی تھی۔ عصا کے سہارے نماز فرض ادا فرماتے تھے۔ خواجہ صاحب نے عرض کیا حضور اتنی مشقت کیوں گوارا فرماتے ہیں۔ قیام گاہ پر ہی نماز کیوں ادا نہیں فرما لیتے۔ پنجگانہ نماز کے لئے مسجد جانا پھر عصا کے سہارے نماز ادا کرنا یہ تو تکلیف مالا یطاق ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ کیسے اپنے بارے میں فیصلہ کرلوں کہ یہ تکلیف مالا یطاق ہے جب کہ آنحضرت نے اپنی وفات کے وقت بھی جماعت ترک نہ فرمائی اور حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے سہارے اس طرح مسجد سے تشریف لے گئے کہ آپ کے دونوں پائے مبارک زمین پر گھستے جا رہے تھے۔‘‘ (ص ۱۰۱ و ص ۱۰۲)

چنانچہ خواجہ حسن نظامی نے حضرت سید شاہ محی الدین قادری کے وصال پر اُن کے جانشین سیدی و مولائی حضرت سید شاہ امان اللہ قادری کو جو تعزیتی خط ارسال کیا ہے، اُس کی نقل دیکھئے:

’’بخدمت حضرت مولانا سید شاہ امان اللہ د صاحب سجادہ نشیں خانقاہ پھلواری شریف السلام علیکم میں آپ کی خدمت میں اپنی طرف سے اور آپ کے سلسلہ چشتیہ نظامیہ سراجیہ کے متوسلین کی طرف سے اور درگاہ حضرت سلطان المشائخ خواجہ سید نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی طرف سے آپ کے والد کی تعزیت کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے بزرگوں کے قدم بقدم چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور آپ ہندوستان کے لئے اسم بامسمی امان اللہ ثابت ہوں۔ آپ کے والد کا مرید اور میرا بڑا لڑکا خواجہ سید حسین نظامی حیدرآباد میں ہے، اس کو میں نے اطلاع بھیج دی ہے۔ میں بہت سی معذوریوں میں مبتلا ہوں اور سفر کے قابل نہیں رہا ہوں۔ ہوسکا تو چہلم کے موقع پر حاضر ہو جاوں گا۔ دعا گو اور محتاج دعا

حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی خود فرماتے ہیں کہ اُن کے مریدوں کی تعداد ۱۹۱۹ء تک ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اُن کی وفات جولائی ۱۹۵۵ء کو ہوئی اور یہیں دہلی میں تدفین ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی کی وفات کے بعد اُن کے لائق فرزند حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی (متوفی: مارچ ۲۰۱۵) نے بھی اپنے والد کے نقش قدم پر ہی اُسی حرارت قلبی کے ساتھ پھلواری شریف سے

اپنے قلبی تعلقات کو استوار رکھا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی مرحوم آج حلقہ علم و دانش میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ بھی اپنے والد کی طرح بارگاہ مجیبی کے عقیدتمندوں میں سے تھے اور اکثر و بیشتر خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ تشریف لاتے اور یہاں زیب سجادہ مجیبی حضور سید شاہ امان اللہ قادری سے نہایت شفقت فرماتے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی مرحوم کو بھی متذکرہ بالا تمام سلاسل کی اجازت اُن کے والد سے عطا ہوئی تھی۔ خواجہ حسن ثانی نظامی مرحوم امان المستجرین حضور سید شاہ امان اللہ قادری بن حضور سید شاہ محی الدین قادری بن حضور سید شاہ بدرالدین قادری قدس سرہٗ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''حضرت سید شاہ امان اللہ صاحب نے اپنے بزرگوں کی طرح اس مجاہدہ (خلوت مجیبی) کا حق ادا کیا اور حج اور آخری عمر میں علاج کے مقصد کے سوا کبھی باہر نہیں نکلے، ایک دنیا کسب فیض کے لئے ان کے آستانہ فیض کاشانہ ہی پر پہنچ جاتی تھی۔ وہ مطالعے کے ذریعہ اپنے آپ کو دنیا کے واقعات سے اتنا باخبر رکھتے تھے کہ سب جگہ گھومنے پھرنے والے بھی ان کی معلومات کا مقابلہ کم ہی کر سکتے تھے۔ ان کا تمام وقت یاد اللہ اور مطالعے میں گزرتا تھا۔ مسلسل خلوت نشینی نے ان کے مزاج میں ایسا دھیما پن اور شخصیت میں ایسا وقار پیدا کر دیا تھا کہ اس کی مثال نہیں ملتی تھی، ان کے پاس اعمال او اشغال اور وظائف کا ایسا ذخیرہ تھا جو سینکڑوں سال کی مدت میں جمع ہوا تھا، مگر اس کے باوجود ان کو نئی چیزوں کی جستجو رہتی تھی اور جہاں سے بھی ممکن ہوتا تھا ان چیزوں کو حاصل کر لیتے تھے۔'' (سوانح حضرت امان المستجرین، ص: ۲۵۷ بحوالہ: المجیب سہ ماہی جنوری فروری مارچ ۲۰۱۷ء، ص ۱۷)

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اکتوبر ۱۹۸۳ء میں ایک رات ہمارے والد حضرت سید شاہ نسیم قادری نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ حضور شاہ امان اللہ صاحب، زیب سجادہ خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف علاج کی غرض سے دہلی ہوتے ہوئے امریکہ روانہ ہو رہے ہیں۔ میں اُس وقت جواہر لعل یونیورسیٹی، نئی دہلی میں زیر تعلیم تھا۔ میں نے اس سلسلہ میں مزید تفتیش کی تو پتہ چلا کہ جناب حضور حضرت محبوب الٰہی کے آستانہ مبارک فاتحہ پڑھنے کی غرض سے تشریف لائیں گے۔ میں بستی نظام الدین پہنچ گیا۔ شام کا وقت تھا۔ اُس وقت غیر معمولی بھیڑ دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ جناب حضور تشریف فرما ہیں۔ بہرحال کسی طرح بھیڑ چیرتا ہوا اندر گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سیدی و مولائی جناب حضور شاہ امان اللہ قادری، حضرت محبوب الٰہی کے آستانہ مبارک سے نکل کر آرہے ہیں۔

جمالِ جہاں آرا کی تابنا کی ویسی ہی تھی جیسی میں نے برسوں قبل دیکھی تھی۔ بس چہرہ اطہر سے نقاہت صاف جھلک رہی تھی۔ ہمارے لئے سیدی و مولائی کا یہ آخری دیدار تھا۔ اب جو دیکھتا ہوں، تو کیا دیکھتا ہوں! وہ دیکھئے! کہ خواجہ حسن ثانی نظامی اپنے دونوں ہاتھوں سے حلقہ بنائے جناب حضور کو اس حلقہ میں رکھنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ جناب حضور جیسے ہی سیڑھی چڑھتے ہوئے صحن سے نکل کر حضرت امیر خسرو کے آستانہ کے قریب پہنچتے ہیں کہ خواجہ حسن ثانی نظامی اس طرح خندہ پیشانی سے قدم بوس ہو جاتے ہیں کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سجدہ میں گر گئے ہوں، حالانکہ نعوذ باللہ یہ سجدہ تو قطعاً نہ تھا، مگر یہ یقیناً خواجہ حسن نظامی، خواجہ حسن ثانی نظامی، اُن کے تمام اہل خانہ اور متعلقہ متوسلین کی جانب سے تعظیم عظیم تھی کہ:

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد از یں من دیگرم تو دیگری

(ماہنامہ نقوش کا آپ بیتی نمبر۔ فرید بک ڈپو، دہلی، سوانح محی الملة و الدین، مولانا شاہ عون احمد قادری، نغمات الانس، فی مجالس القدس، مؤلف: حضرت مولانا شاہ ہلال احمد قادری، سہ ماہی المجیب، خصوصی شمارہ: جنوری، دسمبر ۲۰۱۳ء، مدیر: ڈاکٹر شاہ فتح اللہ قادری، خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور ادبی خدمات، مرتبہ: نثار احمد فاروقی، خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری: ایک تجزیاتی مطالعہ، سید محمد نیر رضوی، سالنامہ منادی ۱۳۶۵ میلادی، حسین بن حسن نظامی، صحیفہ امان، مرتبہ: ڈاکٹر شاہ فتح اللہ قادری، سوانح حضرت مولانا سید شاہ محمد امان اللہ قادری پھلواروی، شاہ ہلال احمد قادری پھلواروی اور تصوف: رسم و حقیقت، خواجہ حسن ثانی نظامی سے خصوصی اخذ و استفادہ کے ساتھ) ❀❀

حلیم صابر

2, Chamru Singh Lane, Kolkata - 700011 (Mob. 9163052340)

ادب کا ایک گمشدہ ورق: شمسؔ کرائے پرسرائیوی

انقلاب زمانہ نے ہمیشہ اپنے پیچھے ایسے اثرات مرتب کئے ہیں جن کے سبب زمانے والوں کو عروج وزوال کی منزل سے گزرنا پڑا ہے۔ ہندستان کی تحریک آزادی کے بطن سے پیدا ہونے والا انقلاب بھی ایک ایسا ہی انقلاب تھا جو آخر کار تقسیم ہند تک پہنچا اور اس سے قبل اوراس کے بعد جو بھیانک منظر سامنے آیا وہ فسادات کے شعلوں میں گھرا ہوا منظر تھا۔ فسادات کے متاثرین جو ترک وطن کے کرب سے دوچار ہوئے ان میں خوشحال بدحال سبھی قسم کے لوگ تھے۔ علاوہ ازیں اہل علم و ادب کا قافلہ بھی ہجرت کی راہ پر گامزن تھا۔ انہی کاروان ادب میں شہر پٹنہ سے چودہ میل جنوب کی جانب ایک گاؤں کرائے پرسرائے میں آباد سید عبدالغنی شمسؔ کا خاندان بھی شامل تھا۔ شمسؔ کی ولادت اُسی گاؤں میں ۱۹۱۱ء میں ہوئی۔ اُن کے والد ماجد سید عبدالحفیظ خلف الرشید سید عبدالشکور اس گاؤں کے شرفا میں شمار کئے جاتے تھے۔ بہار میں تقسیم ہند سے قبل جب فسادات کا سلسلہ چل پڑا تو اس گاؤں کے چند خاندان ترک وطن پر آمادہ ہوئے اور اسی درمیان میں عبدالغنی شمسؔ بھی اپنے پورے خاندان کے ساتھ تقسیم ہند سے قبل کراچی چلے گئے اور ایک مدرسہ میں عربی کے مدرس کی حیثیت سے درس وتدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔

شمسؔ نے پھلواری شریف اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے عربی کی تعلیم کے بعد مدرسہ اکزامینیشن بورڈ پٹنہ سے عالم وفاضل کی سند لی تھی۔ وہ بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کے دونوں چھوٹے بھائی بھی کراچی بہار کالونی میں شمسؔ کے ساتھ ہی رہتے تھے، شمسؔ کے والد عبدالحفیظ داروغہ تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد پنشن وغیرہ لے کر وہ بھی کراچی میں جا بسے۔

شمسؔ ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ غزل اور نظم دونوں بہت خوب کہتے تھے۔ بہار کے معروف صوفی شاعر مولانا تمنا عمادی پھلواروی سے انہیں شریف تلمذ حاصل تھا۔ شمسؔ غزل کے شاعر تھے، لیکن نظم بھی خوب کہتے تھے اور بطور خاص آزاد نظم بھی وہ اس عہد میں کہتے تھے جب کہ آزاد نظموں کا چلن آج کی طرح عام نہیں تھا۔ مثلاً ان کی ایک نظم ''مہر عظمت'' کے چند اشعار دیکھئے جو آزادی کے بعد کی یادگار ہے۔

تری قیادت میں ہم نے پائی
وہ منزل آرزو کہ جس کو
نہ جانے کب سے
ہم اپنے خوابوں میں تھے بسائے
لہو میں ہر گام پر نہائے
رکے نہ پھر بھی قدم ہمارے
تھکے نہ ہارے
عجیب دور غم ومحن تھا
بڑا ہی دلدوز وہ سماں تھا
دکھوں کے صحرا میں
کاروانِ ستم کشاں
چارسو رواں تھا
امید کی ننھی سی کرن بھی
سواد دل میں بجھی ہوئی تھی
تری صدا نے ہمیں جگایا
ہمارے عزم مجاہدانہ میں جوش آیا
اجل نصیبوں کو ہوش آیا
وہ نعرۂ حق کی گونج جس سے
دل ہمالہ بھی کانپ اٹھا
بہ فیض جہد مسلسل آخر

عظیم قربانیاں ہماری
جہاں میں کامیاب ٹھہریں

شمسؔ نظموں کے علاوہ غزل بھی خوب کہتے تھے۔ غزل کے اشعار سے اُن کی قادرالکلامی جھلکتی ہے۔ ان کی غزلوں کا رنگ بھی روایتی انداز کے باوجود بالکل جداگانہ ہے۔ غزل میں شمسؔ نے جس نوعیت کے مضامین باندھے ہیں، وہ اس پرآشوب دور کے ترجمان ہیں ۔

لگی ہے آنکھ مگر کم ہے اضطراب ابھی
دکھائی دیتے ہیں کیا کیا سہانے خواب ابھی
شکستہ دل ہوں مگر لب ہیں آشنائے فغاں
کہ بج رہا ہے یہ ٹوٹا ہوا رباب ابھی
ڈبو رہا ہے لہو میں قلم مصور وقت
کہ ناتمام ہے تصویرِ انقلاب ابھی
شعورِ راہ نہ منزل سے آگہی اُن کو
بھٹک رہے ہیں ترے خانماں خراب ابھی

الغرض شمسؔ کی حالت بھی اُن مہاجروں جیسی تھی جنہوں نے جنت ارضی سمجھ کر پاکستان کا رخ کیا تھا کہ وہاں عافیت نصیب ہوگی، مگر پاکستان میں بہت کم لوگوں کو عافیت نصیب ہوئی۔ مہاجرین کی اکثریت جو ہجرت کے کرب کو جھیل کر ملک عدم کو جا بسی، وہ اگرچہ اپنے کرب کا اظہار نہ کرسکی، لیکن ایک شاعر جو حساس دل رکھتا ہے وہ بھلا کیوں کر خاموش رہ سکتا تھا، لہٰذا شمسؔ نے اس کرب کی ترجمانی اپنی غزلوں کے اشعار میں کی۔ ذیل کے اشعار اس کی وضاحت کے لئے کافی ہیں ۔

عرصۂ حشر کہاں جلوہ گہہ یار کہاں
لئے جاتا ہے مجھے وعدۂ دیدار کہاں
یہ بھی ان مست نگاہوں کا کرشمہ تو نہیں
مفتیٔ شہر کہاں ، خانۂ خمار کہاں
کس کو ملتی ہے یہاں گردش دوراں سے نجات
آدمی رونق دنیا سہی ، مختار کہاں

بہار کی ادبی تاریخ میں شمسؔ کرائے پرسرائیوی کا ذکر بحیثیت نظم گو کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شمس کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا اور میلان طبع خاص طور پر نظموں کی طرف ہی تھا، مگر نظم گوئی کے ساتھ ساتھ ان کا طرز غزل گوئی بتا دیتا ہے کہ وہ نظم اور غزل دونوں صنفوں پر عبور رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ شمسؔ بچوں کے ادب سے بھی کافی شغف رکھتے تھے۔ جب تک ہندوستان میں رہے رسالہ ''ندیم'' (گیا) میں ان کا کلام اکثر و بیشتر شائع ہوا کرتا تھا۔ ترک وطن کے بعد شمس کا کلام ریڈیو پاکستان کراچی سے اکثر نشر ہونے لگا۔ شمسؔ نے معریٰ نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن افسوس پاکستان پہنچ کر ان کی شاعری کی پذیرائی نہ ہوسکی جس کے وہ مستحق تھے۔ آخر میں ان کی ایک غزل پیش کی جاتی ہے ۔

دلوں میں نقش وفا جب ابھرنے لگتے ہیں
غم حیات کے تیور سنور نے لگتے ہیں
شفق کے خون میں جب ڈوبتی ہے شامِ چمن
تو ڈالیوں پہ شگوفے نکھرنے لگتے ہیں
صبا کے ایسے بھی بے رحم جھونکے ہیں، جن سے
ورق گلوں کے چمن میں بکھرنے لگتے ہیں
نصیب ہوتی ہے انساں کو جب خود آگاہی
تو آسماں سے فرشتے اُترنے لگتے ہیں
دلوں کو چھیڑنے لگتا ہے جب تصورِ مرگ
تو زندگی کے تقاضے اُبھرنے لگتے ہیں
نہیں وہ واقف اسرار جادہ پیمائی
جو قافلے سر منزل ٹھہرنے لگتے ہیں
سمجھ میں آتا ہے راز حیات پھر اے شمسؔ
بہار عیش کے دن جب گزرنے لگتے ہیں

❁❁❁

خصوصی توجہ طلب

اکادمی مجلّہ ماہنامہ ''زبان و ادب'' کے بارے میں ساری معلومات کے لئے انچارج جناب محمد شاہد سے ان کے موبائیل 9897958115 پر نیز مسودات اور کتابوں پر انعامات کے سلسلے میں انچارج جناب محمد تمنا سے ان کے موبائیل 9931606459 پر رابطہ کریں۔ شکریہ! (ادارہ)

عبیدالرحمٰن
J.N.U. New Delhi - 110067

نظم 'ایک لڑکا': وقت اور ماضی کا تفاعل

اختر الایمان ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں کی نسل کے ہم سفر ہیں۔ یہ متوازی میلانات یا قافلے دو مختلف سمت کی جانب گامزن تھے اور ایک دوسرے پر جملہ کسنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ اختر الایمان نے اپنی ادبی روایت کے ان دونوں پیمانۂ اقدار، مزاج اور مجموعی رنگ و آہنگ کا اثر انگیز کیا، لیکن ان سے الگ ہٹ کر اپنی منفرد شناخت بھی قائم کی۔ ان کو کسی ایک قافلے کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جاسکتا، وہ دونوں کے ساتھ بھی ہیں اور دونوں سے جدا بھی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

> ''اختر الایمان ان دو ایک شاعروں میں سے ہیں جن پر آسانی سے کوئی لیبل نہیں لگایا جاسکتا۔ ان کے یہاں خارجی زندگی کا ادراک بھی ہے اور فرد کی داخلی زندگی کے پیچیدہ اور متنوع مسائل بھی، سیاسی اور اجتماعی محرکات بھی ہیں اور جنسی اور عشقیہ بھی۔ شعری روایات سے استفادہ بھی ہے اور نئے اسالیب واظہار کی جستجو بھی۔ ان کی نظموں میں نہ تنہا موضوع اور طرز فکر کو اہمیت حاصل ہے اور نہ ہی ہیئت کا کوئی بہت چونکا دینے والا تجربہ۔ ان کے یہاں اظہار و بیان کے بعض اہم تجربے ہیں، لیکن وہ موضوع سے اس قدر مربوط وہم آہنگ ہیں کہ نامانوس اور اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔ اختر الایمان نہ تو ترقی پسندوں میں پورے طور پر کھپتے تھے اور نہ حلقہ ارباب ذوق کے ساتھ مکمل طور پر وابستہ کیے جاسکتے تھے۔''
>
> (شہر یار، انتخاب، مضامین خلیل الرحمٰن اعظمی، ج ۲، ص ۱۶۲)

اختر الایمان نے تمام ادبی نظریے کے جبر سے آزاد رہ کر شعریات کے پیراہن کو طہارت بخشی اور ''آدمی اگر کسی خاص نظریے کا اسیر ہو جائے تو اپنی نظر کھو جاتی ہے'' کے پیش نظر اپنی فکر کے افق کو وسعت، معنویت اور تہذیبی وقار عطا کرنے کی سعی کی۔ اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' ایسی ہی نظم ہے جو ۱۹۵۴ میں لکھی گئی۔ نظم کی تعمیر میں موضوع کی وسعت اور فنی ریاضت کے سبب اختر الایمان کی شعری استعداد نے تخلیقی معراج کو چھولیا ہے۔ یہاں احساس اور آہنگ کی سطح پر مصرعوں کی باہمی ترتیب اور فضابندی قائم کرنے میں غیر معمولی سلیقہ مندی کا ثبوت پیش کیا گیا ہے۔ ادبی نظریات کے اس ہنگامی دور میں بھی اسے کسی ایک خاص نظریے کے ساتھ فٹ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ یہ سب میں ہے اور سب سے جدا بھی، اس قبیل کی انھوں نے اور بھی نظمیں لکھیں مثلاً ''یادیں''، ''باز آمد'' وغیرہ۔

نظم ''ایک لڑکا'' چار بند پر مشتمل ہے۔ یہ ایک ڈرامائی نظم ہے جو احساس کی سطح پر بے پناہ طنز اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اسے ڈرامائی نظم کہنے کا سبب یہ ہے کہ اس کا مکالماتی انداز شروع سے آخر تک پڑھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے اور بند کے آخری مصرع ''اختر الایمان تم ہی ہو'' کی تکرار سے irony کی شدت میں اضافہ ہوگیا ہے۔

اس نظم میں دو کردار ہیں، ایک معصوم بچہ جو زندگی کے ہر قدم پر شاعر کے سامنے سوالیہ چہرہ لیے ہوئے کھڑا ہے اور شاعر سے باز پرس کر رہا ہے کہ ''اختر الایمان تم ہی ہو'' اور دوسرا ذی شعور، توانا اور پختہ کار انسان جو شاعر کی اپنی ذات ہے۔ ایک ہی کردار کے دو رخ ہیں، ایک لڑکا اس کردار کی صداقت، معصومیت اور ضمیر انسانیت کا علامیہ ہے اور دوسرا باشعور کردار ظاہری شخصیت کا نمائندہ۔

معنیاتی سطح پر جب ہم اس نظم کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں شاعر کے ہمزاد کی کائنات کے اجڑنے کی داستان سنائی دیتی ہے۔ نظم کا آغاز اور انجام قاری کو اختر الایمان کی ذاتی زندگی کی طرف

بھی پلٹ کر دیکھنے کے لیے آمادہ کرتا ہے جس کا ذکر خود اختر الایمان نے اپنے شعری مجموعے ''یادیں'' میں کیا ہے:

''مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ ہمیشہ یاد رہا ہے اور یہ واقعہ ہی اس نظم کا محرک ہے۔ ہم ایک گاؤں سے منتقل ہو کر دوسرے گاؤں جا رہے تھے۔ اس وقت میری عمر تین چار سال کی ہوگی۔ ہمارا سامان ایک بیل گاڑی میں لادا جا رہا تھا اور میں اس گاڑی کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میرے چہرے پر کرب اور بے بسی تھی، اس لیے کہ میں اس گاؤں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں؟ یہ بات میں اس وقت نہیں سمجھتا تھا، اب سمجھتا ہوں۔ وہاں بڑے بڑے باغ تھے۔ باغوں میں کھلیان پڑتے تھے.....مگر وہ معصوم لڑکا اس گاڑی کو روک نہیں سکا۔ میں اس گاڑی میں بیٹھ کر آگے چلا گیا، مگر وہ لڑکا وہیں کھڑا رہ گیا۔'' (کلیات اختر الایمان، ص ۴۸)

اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ وہی بچہ ہے جو اختر الایمان کو اس کی زندگی کے ہر موڑ پر ٹوک رہا ہے۔ اس معصوم بچے کے عزم و ارادے بچپن سے جوانی تک کیا تھے، اس کی ترجیحات کیا تھیں اور وہ زندگی کو کس زاویے سے دیکھنا پسند کرتا تھا، یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ یہ بچہ ایک ایسے عزم کی تکمیل کا خواہاں تھا جہاں کذب و افترا اور ریاکاری کا شائبہ نہ ہو، بلکہ ایثار و قربانی، حق گوئی و بے باکی کا دور دورہ ہو، وہ بچہ ہمدردانہ رویے اور انسانیت کے جذبات سے مملو ہو کر اپنے فرائض کی ادائیگی کرنا چاہتا تھا۔ وہ بار امانت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا پیکر بن کر زندگی گزارنا چاہتا تھا، لیکن آج جب وہ اپنے تعمیری کردار کو پختہ عمر شاعر کے روپ میں دیکھتا ہے تو حیرت زدہ ہے کہ اس نے بچپن کے خواب، حوصلے اور ارادے کو ریزہ ریزہ کر کے قصہ پارینہ کی شکل عطا کر دی۔ شاعر کی صورت ایک بچے میں بھی ہے اور شاعر خود اپنے آپ میں بھی ہے اور ان کے مکالماتی تفاعل سے نظم کی معنیاتی سطح ابھر کر سامنے آتی ہے۔

نظم کا آغاز ''دیار شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر'' سے ہوتا ہے۔ شاعر اپنی نظم کی ابتدا موضوع کے کسی پہلو سے کر دیتا ہے، اس کے نزدیک یہ امتیاز نہیں کہ نظم کا کینوس کیا ہے اور اس کی شروعات کہاں سے ہونی چاہیے؟ نظم کا پہلا مصرع پڑھتے ہی نظم کا جمالیاتی تفاعل قاری کے ذہن کو اپنی جانب منعطف کر لیتا ہے۔ لفظ ''شرق'' اور ''اونچے ٹیلے'' کا استعاراتی تفاعل غور و فکر کا تقاضہ کرتا ہے۔ ''شرق'' مشرق کا مخفف ہے جہاں مشرقی ممالک آباد ہیں جو مشرقی اقدار اور روایات و تہذیب کے امین ہیں۔ ہمارے ملک کا تہذیبی تشخص اور ثقافتی تنوع بھی اسی میں پیوست ہے۔ ''اونچا ٹیلہ'' ملک کے سماجی اور معاشرتی نظام کا اشاریہ ہے۔ ہمارا سماج اور معاشرہ آموں کے باغوں، کھیتوں کی مینڈوں، جھیلوں کے پانی، بستی کی گلیوں، کم سن حسینوں کی ٹولیوں، میلوں اور ناٹکوں کی بھیڑ، پرندوں کے چہچہے، جلتی ریت، برفیلی ہواؤں، آبشاروں کے ترنم، مدرسوں اور خانقاہوں کا زائیدہ ہے، جہاں صبح سے شام تک ہمارے اوقات گزرتے ہیں۔

نظم کے پہلے بند میں شاعر نے ہمارے معاشرے کی تہذیبی و ثقافتی اقدار کو اس کے تمام تر جمالیاتی خصائص کے ساتھ نشان زد کیا ہے اور یادوں کے ذریعہ اپنے ماضی کی منظر کشی کی ہے۔ اس بند کا سراپا ہی یہ بتاتا ہے کہ شاعر ماضی کی یادوں میں گم ہے جہاں شاعر کا بچپن ایک مضبوط کردار کی بنیاد قائم کرنے کا عزم رکھتا تھا۔

دوسرے بند میں توانا کردار اللہ تبارک و تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہے۔ بند کی شروعات ''خدائے عزوجل کی نعمتوں کا معترف ہوں میں'' سے ہوتی ہے۔

یہ بند اٹھارہ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ ان تمام مصرعوں میں شاعر خدا کی نعمتوں کا اعتراف کر رہا ہے اور انسان کے فرائض منصبی کا بھی ذکر کر رہا ہے کہ اللہ نے انسان کو اس کائنات میں پیدا کر کے اس پر کیسی کیسی عنایت کی ہے اور کیسی کیسی ذمہ داریاں عائد کی ہیں ''میری تخلیق کی، مجھ کو جہاں کی پاسبانی دی'' شاعر اقرار کرتا ہے کہ خدا نے انسان کے حسب ضرورت ہی اس کائنات کی تخلیق کی۔ خوبصورت اور حسین نظارے، سورج، چاند اور ستاروں کی روشنی، سمندر کی تہوں میں موتیوں کے بستر، خوشبوؤں سے لبریز مست ہوائیں، یہ سب خدائے واحد کی قدرت پر دال ہیں۔

وہ حاکم قادر مطلق ہے، یکتا اور دانا ہے
اندھیرے کو اُجالے سے جدا کرتا ہے
میں خود کو اگر پہچانتا ہوں
اس کی محنت اور سخاوت ہے

شاعر ایک طرف قدرت کی صناعی اور حسن تخلیق کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے تو دوسری طرف وہ ذات واحد کا شاکی بھی ہے کہ نااہلوں کو اس نے دولت سے نوازا ہے اور شریفوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کیا ہے۔ یہ انسانی کردار کی کمزوری ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ دوسروں کی دولت و ثروت اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی ہے۔ بند میں اندھیرے اوراجالے کے مابین جو امتیاز ہے وہ معاشرے کی منفی، تخریبی اور مثبت، تعمیری اقدار کا علامیہ ہیں۔

تیسرا بند چودہ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انسان کے بار امانت اٹھانے کے ساتھ فن کار کی بے بسی اور لاچاری کا بھی ذکر ہے۔ فن کار نے اپنے عہد کی آلودہ سیاسی فضا، معاشی ناانصافی اور سماجی عدم مساوات کو ثقافتی سیاق عطا کر کے شعری تشکیل کی ہے۔

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے
میرے قبضہ میں جز اِک ذہن رسا کچھ بھی نہیں
پھر بھی مگر مجھ کو
خروش عمر کے اتمام تک اک بار اٹھانا ہے

شاعر اپنی مجبوری سے اچھی طرح واقف ہے کہ انسان کے پاس سوائے ذہن کے اور کچھ بھی نہیں، پھر بھی زندگی کو انجام تک پہنچانا اس کا اہم فریضہ ہے۔ زندگی کی آخری سانس تک خواہ اس کے اوپر غم کا پہاڑ ٹوٹے، لیکن اپنی تمام ذمہ داریوں کے ساتھ اسے زندگی بسر کرنا ہے۔ بڑے بڑے اہل منصب، رئیس، نواب، زمیندار جن کے پاس زندگی گزارنے کی تمام سہولتیں میسر ہیں، ان کی جی حضوری کرنا، اصولوں سے سمجھوتہ کرنا، حق کو باطل اور باطل کو حق کہہ کر اپنی مقصد برآری کے لیے جہد مسلسل کرنا اس کی مجبوری بن گئی ہے، لیکن جب یہ باشعور انسان جو فن کار کا واضح روپ ہے، غم ہائے حیات کے باعث غلطاں و پیچاں نظر آتا ہے تو شاعر کا ہمزاد ضمیر جو زندہ کردار کی شکل میں اپنا مستقل وجود رکھتا ہے اور اس کا ہم سفر بھی ہے، وہ اس سے پوچھتا ہے:

''اختر الایمان تم ہی ہو''

بچے کے اس سوال کرنے میں ایک طنز پوشیدہ ہے کہ معبود حقیقی کے سوا کوئی اس کائنات کا مالک نہیں، پھر ان کمینہ صفت لوگوں اور فریب کاروں کے حضور دست سوال کیوں دراز کر رہے ہو، لیکن تخلیق کار کا توانا روپ یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ ان ارباب اقتدار کے حضور نہ گڑگڑاؤں تو اپنے مقصد کی حصولیابی ممکن نہیں۔ یہ معاشرے کے اخلاقی زوال کا اشاریہ ہے کہ جن کے ہاتھوں میں زمام اقتدار ہے، وہ فرد کی مجبوری اور بے چارگی کا بے رحمی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک فن کار کی بے بسی بھی اسے اپنا تخلیقی سرمایہ داؤ پر لگانے سے باز نہیں رکھتی، جب کہ یہی سرمایہ کسی فن کار کا سرچشمہ حیات ہوتا ہے۔

آخری بند کے نو مصرعوں میں ہمزاد کے مسلسل استفسار پر وہ سخت لب ولہجہ اختیار کرنے پر مجبور ہے۔

''یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج، اندوہ پرور، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اس کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں!

شاعر اپنی صفائی میں کذب بیانی کا سہارا لیتا ہے کہ ایک مدت ہوئی میں اس اختر الایمان کو فریبوں کا کفن پہنا کر آرزوؤں کی قبر میں دفن کر چکا ہوں جس نے دنیا کے اندر مساوات، انسانیت، حق گوئی و بے باکی، ایمانداری اور اخلاقی اقدار کو پھیلانے کا خواب سجویا تھا۔ اب اس کے خواب اور اس کا وجود اس کی ملکیت نہیں۔ زندہ رہنے کی خاطر سماج سے مفاہمت کرنا پڑتا ہے، یہاں تک کہ ضمیر مردہ ہو جاتا ہے، لیکن اگر ضمیر زندہ ہے اور انسان کا ظاہری روپ باطن کے خلاف عمل کرے تو وہ اسے ملامت ضرور کرے گا۔

یہ لڑکا مسکراتا ہے، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب وافترا ہے، جھوٹ ہے، دیکھو میں زندہ ہوں!

وہ کم سن بچہ، وہ فن کار کا ضمیر جو اصلاح کا ڈنڈا لیے ہوئے زندگی کے ہر

موڑ پر اس کے ساتھ پھر رہا ہے، وہ احساس دلاتا ہے، طنز کرتا ہے کہ تم سراسر جھوٹ بول رہے ہو، بہتان تراشی کر رہے ہو، میں تو تمہارے سامنے زندہ کھڑا ہوں۔ فن کار کا یہ ''ہمزاد'' جو اس پر مسکرا رہا ہے، یہ مسکرانا شاعر کے دل میں نشتر کی طرح چبھ رہا ہے جو طنز کا نشتر ہے، شاعر سمجھ بھی رہا ہے کہ یہ بچہ سچ بول رہا ہے، لیکن زندگی کی سچائی کے سامنے وہ سرنگوں ہے جہاں جھوٹ اور فریب کا ساتھ دینا اس کی مجبوری بن چکی ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن اور ڈاکٹر خواجہ نسیم اختر نے اختر الایمان کی اس نظم کا موازنہ ورڈزورتھ کی نظم ''there was a boy'' سے کیا ہے، لیکن یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ یہ نظم ورڈزورتھ کے کینوس سے بہت آگے جا پہنچی ہے۔ ورڈزورتھ نے ماضی میں غوطہ لگا کر اپنے ماضی کی یادوں کو بت بنا کر پوجا ہے، لیکن اختر الایمان نے اپنے بچپن کی یادوں کو محسوس کیا ہے اور اصلاح کا ایک ایسا آئینہ بھی دیکھا ہے جس میں زندگی کے حق و باطل کا نقشہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اختر الایمان نے صرف پیار و محبت سے اس کی پیشانی ہی نہیں چومی ہے بلکہ پیشانی کی تحریروں کو پڑھنے کی سعی بھی کی ہے۔

اختر الایمان کی شاعری کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی شعری تشکیل میں وقت اور یاد ماضی کے تفاعل کو ایک مرکزی نقطہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ''بنت لمحات'' کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میری نظموں میں وقت کا تصور اس طرح ملتا ہے جیسے
> یہ بھی میری ذات کا ایک حصہ ہے اور یہ طرح طرح سے
> میری نظموں میں میرے ساتھ رہتا ہے۔ کبھی یہ گزرتے
> ہوئے وقت کا علامیہ بن جاتا ہے، کبھی خدا بن جاتا ہے،
> کبھی نظم کا ایک کردار۔ 'باز آمد' میں رمضانی قصائی وقت
> ہے 'بیداد' میں خدا وقت ہے، 'وقت کی کہانی' میں گرداب
> زیست وقت ہے، اور 'کوزہ گر' میں سامری وقت ہے۔''
> (کلیات اختر الایمان، ص ۳۰)

ان کی فکر کا یہ نقطہ ''یادیں''، ''باز آمد'' اور ''پرانی فصیل'' میں بھی نشان زد کیا جا سکتا ہے۔ ''پرانی فصیل'' کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے ۔

مری تنہائیاں مانوس ہیں تاریک راتوں سے
مرے رخنوں میں ہے الجھا ہوا اوقات کا دامن
مرے سائے میں حال و ماضی رک کر سانس لیتے ہیں
زمانہ جب گزرتا ہے، بدل لیتا ہے پیراہن

یہ خاطر نشان رہے کہ اختر الایمان کے یہاں وقت کا تصور اپنی ایک خاص انفرادیت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ واقعی ان کی فکر وقت اور ماضی کی یادوں میں اس طرح دست و گریباں ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے یہاں یاد ماضی عذاب نہیں ہے، ہدایت کا ایک سرچشمہ ہے۔ وہ ماضی کی یادوں سے ایسا درس لیتے ہیں جو حسین زندگی کی تعمیر میں سدا ان کا ہم سفر رہے۔ وقت اور یاد ماضی کی دوئی نے اختر الایمان کی شعریات کی تشکیل میں بھر پور معاونت کیا ہے۔ ❁❁

فارم IV

دیکھئے : رول ۸

(۱) مقام اشاعت : بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ۔۴

(۲) اوقات اشاعت: ماہانہ

(۳) پرنٹر کا نام	:	ابرار احمد خان
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ۴
(۴) پبلشر کا نام	:	ابرار احمد خان
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	اردو بھون، اشوک راج، پٹنہ
(۵) ایڈیٹر کا نام	:	ابرار احمد خان
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ
(۶) ملکیت	:	بہار اردو اکادمی

میں ابرار احمد خان ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

محمد معتصم باللہ
Research Scholar, M.U. Bodhgaya (Mob. 9955361269)

منور رانا: سفاک عہد کا معصوم شاعر

یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ہر ادیب یا شاعر زندگی کے بدلتے ہوئے اقدار، رفتار، ترقی اور تبدیلی سے حد درجہ متاثر ہوتا ہے۔ تاثر پذیری سے تجربات کو بروئے کار لاتا ہے اور تخلیقی عمل پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اپنے خیالات و احساسات کو دوسروں تک منتقل کرنے کے لیے وہ اپنی شخصیت اور ادبی مزاج کے مطابق ایک پیرایۂ بیان اپناتا ہے جسے ہم ادب کی اصطلاح میں اسلوب یا اندازِ بیاں سے موسوم کرتے ہیں۔ خیال خواہ کتنا ہی اہم ہو، اگر اسے بتانے کے لیے موزوں الفاظ، مناسب پیرایۂ بیان اختیار نہ کیا جائے تو اس کے اظہار و ابلاغ تک رسائی قاری کے لیے آسان نہیں۔ یہی وہ اسلوب ہے جس نے منور رانا کی شاعری کو ابدیت عطا کی اور دانشوری سکھائی۔

منور رانا اردو ادب کا ایک ایسا نام ہے جس نے اپنی شاعری کے ذریعے نئی راہوں کا انتخاب کیا۔ ان کی شاعری میں اپنے محبوب کے حسن و جمال کو نہیں بلکہ معاشرے کے ان مسائل کو جگہ ملی، جن پر شاعری میں عموماً بات نہیں کی جاتی۔ منور رانا نے اپنی شاعری میں لفظ ''ماں'' استعمال کر کے اردو غزل کو ایک نیا موضوع دیا اور پھر یوں ہوا کہ ہر شاعر نے اسے استعمال کیا۔ ''ماں'' پر لکھے ہوئے ان کے شعروں نے انہیں ایک الگ پہچان دی۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ جب ایک عام سی شکل کی عورت میری محبوبہ ہو سکتی ہے تو پھر میری ماں کیوں نہیں جس نے میری پیدائش میں خدا کا کردار ادا کیا تھا۔

محبت کرتے جاؤ، کہ یہی سچی عبادت ہے
محبت ماں کو بھی مکہ مدینہ مان لیتی ہے

چلتی پھرتی ہوئی آنکھوں سے اذاں دیکھی ہے
میں نے جنت تو نہیں دیکھی ہے ماں دیکھی ہے

کسی کو گھر ملا حصے میں یا کوئی دُکاں آئی
میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا، مرے حصے میں ماں آئی

مختصر ہوتے ہوئے بھی زندگی بڑھ جائے گی
ماں کی آنکھیں چوم لیجئے، روشنی بڑھ جائے گی

تیرے دامن میں ستارے ہیں تو ہوں گے اے فلک
مجھ کو اپنی ماں کی میلی اوڑھنی اچھی لگی

یہ منور رانا کے قلم کا ہی کمال تھا، جس نے اردو غزل میں ''ماں'' کو عظیم مقام عطا کیا۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے معاشرے اور سیاست کو جس طرح آئینہ دکھایا ہے، اس تجربے نے انہیں ایک عظیم شاعر بنا دیا ہے۔

منور رانا کی شاعری دراصل عصری اور ابدی حقائق کی برجستہ اور کامیاب ترین ترجمان کہلانے کا حق رکھتی ہے۔ انہوں نے صرف ماں کی محبت اور عظمت اور احوالِ مہاجرت کے تعلق سے کرب آگیں احساسات ہی اپنی شاعری میں نہیں لایا ہے بلکہ بہت سارے دیگر موضوعات و افکار بھی ان کی شاعری کا حصہ بنتے رہے ہیں۔ یادوں کے حوالے سے بچپن کی نفسیات، روحِ آزادی کا کامیاب تمثیلی اشارہ، انتہاہی مضامین، اردو اور ہندی کے رشتہ کی باتیں، بعض لطیف رومانی تمنائیں اور غربت کی نفسیاتی تصویریں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

لپٹ جاتی ہے سارے راستوں کی یاد بچپن میں
جدھر سے گزرتا ہوں میں، رستہ یاد رہتا ہے
اگر سونے کے پنجڑے میں بھی رہتا ہے تو قیدی ہے
پرندہ تو وہی ہوتا ہے جو آزاد رہتا ہے
چمن میں گھومنے پھرنے کے کچھ آداب ہوتے ہیں
اُدھر ہرگز نہیں جانا، اُدھر صیاد رہتا ہے

ہمیں بھی اپنے اچھے دن ابھی تک یاد ہیں راؔنا
ہر اک انسان کو اپنا زمانہ یاد رہتا ہے

سگی بہنوں کا جو رشتہ ہے اردو اور ہندی میں
کہیں دنیا کی دو زندہ زبانوں میں نہیں ملتا

میری ہتھیلی پہ ہونٹوں سے ایسی مہر لگا
کہ عمر بھر کے لئے میں بھی سرخرو ہوجاؤں

بھٹکتی ہے ہوس دن رات سونے کی دکانوں میں
غریبی کان چھدواتی ہے ، تنکا ڈال لیتی ہے

اتر پردیش کے رائے بریلی میں پیدا ہونے والے منور رانا کی پرورش کلکتہ میں ہوئی۔ انہوں نے شاعری کو پیشہ نہیں بنایا بلکہ شاعری کو معاشرے کا ایک آئینہ بنا کر عوام کی عدالت میں کھڑا کیا۔ کھیتوں، کھلیانوں، مکانوں، آنگنوں یا انسانی زندگی سے متعلق شاید ہی کوئی ایسا موضوع رہا ہو، جس پر منور رانا نے شاعری نہ کی ہو۔ منور رانا نے معاشرے کے ہر اس ایشو پر شاعری کی ہے جو انسانی زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں فرقہ واریت ، سیاسی چالوں، سیاسی سازشوں، شہروں کی خود غرض زندگی اور دیہی روایات کو جگہ دے کر ایک الگ مقام حاصل کیا ؎

تمہارے شہر میں میت کو سب کاندھا نہیں دیتے
ہمارے گاؤں میں چھپّر بھی سب مل کر اُٹھاتے ہیں

یہ شہر اور دیہاتی زندگی کا ایک سچ ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سیاست پر جس طرح نکتہ چینی کی ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شاعری گمراہ سیاست کو راستہ ضرور دکھا سکتی ہے، لیکن اس کے ساتھ نہیں چل سکتی ؎

سیاست سے ادب کی دوستی بے میل لگتی ہے
کبھی دیکھا ہے پتھر پہ بھی کوئی بیل لگتی ہے

منور رانا عہد حاضر کے مقبول ترین شاعروں میں سے ایک تھے۔ ان کی موجودگی کسی بھی مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ ان کے اشعار میں ایسا جادو تھا کہ لوگ ان کی طرف کھنچتے چلے جاتے تھے۔ وہ ڈوب کر شعر کہتے تھے۔ الفاظ کے زیر و بم، ان کے لہجے سے بھی عیاں ہوتے تھے۔ منور رانا نے برسوں مشاعروں میں اپنا سکہ چلایا اور اس معاملے میں کوئی ان کی ہمسری نہیں کرسکا۔ ان کا انداز قلندرانہ تھا اور وہ اسے ہی اپنی سب سے بڑی دولت سمجھتے تھے۔ بقول خود ؎

بادشاہوں کو سکھایا ہے قلندر ہونا
آپ آسان سمجھتے ہیں منوؔر ہونا

منور رانا صرف قادرالکلام شاعر ہی نہیں تھے بلکہ صاحب طرزِ ادیب بھی تھے۔ ان کی نثر میں بلا کی ندرت، شگفتگی اور برجستگی ہے۔ ناقدین ادب ان کی شاعری سے زیادہ ان کی نثر کو اہمیت دیتے ہیں۔ منور رانا کی جو اہم کتابیں منظر عام پر آئیں اُن کے نام اس طرح ہیں: ''نیم کا پھول'' (۱۹۹۳ء) ''کہو ظل الٰہی سے''، ''منور رانا کی سوغزلیں'' (۲۰۰۰ء) ''ماں'' (۲۰۰۵ء) ''جنگلی پھول'' (۲۰۰۸ء) ''نئے موسم کے پھول'' (۲۰۰۹ء) ''مہاجر نامہ''، ''کترن میرے خوابوں کے'' (۲۰۱۰ء) ''غزل گاؤں'' (۱۹۸۱ء) ''پیپل چھاؤں'' (۱۹۸۴ء) ''مور پاؤں'' (۱۹۸۷ء) ''سب اس کے لیے'' (۱۹۸۹ء) ''بغیر نقشہ کا مکان'' ''چہرے یاد رہتے ہیں''، ''میر آ کے لوٹ گیا''، ''بدن سرائے'' (۱۹۹۶ء) ''شہدابہ''، ''سخن سرائے'' (۲۰۱۲ء) ''پھر اکبیر'' (۲۰۰۷ء) ''ڈھلان سے اترتے ہوئے'' اور ''پھنک تال'' وغیرہ۔ ان کے خاکے اور انشائیے بھی ان کے شعروں جیسا لطف عطا کرتے ہیں کیوں کہ ان میں تخلیقی نثر کی خوبیاں بہر صورت روشن ہیں۔

تقسیم ہند کے نتیجے میں ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان جانے والوں کے درد کو منور رانا نے جس خوبصورتی سے بیان کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اس موضوع پر انہوں نے ''مہاجر نامہ'' کے نام سے تقریباً پانچ سو اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم کہی ،جس نے مقبولیت کا ریکارڈ قائم کیا۔ اس رزمیہ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کئی آنکھیں ابھی تک یہ شکایت کرتی رہتی ہیں
کہ ہم بہتے ہوئے کاجل کا دریا چھوڑ آئے ہیں
مہاجر کہہ کے دُنیا اس لیے ہم کو ستاتی ہے
کہ ہم آتے ہوئے قبروں میں شجرہ چھوڑ آئے ہیں
سیاست کے بنے ایک جال میں ہم پھنس گئے آخر
اگر ہم شاہ تھے تو کیوں رعایا چھوڑ آئے ہیں

''مہاجر نامہ'' اردو دنیا میں پہلا تجربہ تھا، جسے منور رانا نے بڑی خوبصورتی سے انجام دیا۔ ''مہاجر نامہ'' ان کے تخیل کی ایسی اُپج ہے جس سے ان کے تخلیقی وفور کا پتہ چلتا ہے۔ یہ انسانی دکھوں کی معراج ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا، اسے اردو شاعری میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ بے شک وہ نہ غالبؔ اور اقبالؔ تھے اور نہ میرؔ وانیسؔ، جدید شعرا میں بشیر بدرؔ، ندا فاضلی اور شہریارؔ کی پہچان بھی اُن کی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن کی مقبولیت بے پناہ تھی۔ ہر طبقے میں اُن کے اشعار پہنچے۔ انہیں اردو سماج کا ترجمان اور نمائندہ بننے کا بھی قومی اور بین الاقوامی سطح پر موقع نصیب ہوا۔

منور رانا کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اظہارِ خیال کے لیے اپنی غزلوں کے الفاظ و بیان میں ملمع سازی سے کام نہیں لیتے ہیں بلکہ اپنی زندگی کے تجربات، حادثات اور عصر حاضر کے مشاہدات کو نہایت سلیقے اور جرأت مندی سے قارئین وسامعین تک بحسن تمام پہنچا دیتے ہیں۔ رانا کی شاعری کو ایوانِ سیاست میں ہڑکم مچانے کے حوالے سے بھی خوب شہرت ملی۔ حالاتِ حاضرہ اور وطن میں پھیل رہی بدنظمی، نفرت اور گندی سیاست کو آئینہ دکھانے کے لیے انہوں نے لکھا ہی نہیں خوب لکھا۔ ذیل میں کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

وزارت کے لیے ہم دوستوں کا ساتھ مت چھوڑو
ادھر اقبال آتا ہے ادھر اقبال جاتا ہے

فضا میں گھول دی ہیں نفرتیں اہل سیاست نے
مگر پانی کنوئیں سے آج تک میٹھا نکلتا ہے

اگر آداب کر لیتے تو مسند مل ہی جاتی
اگر لہجہ بدل لیتے گورنر ہو گئے ہوتے

ان کا کہنا تھا کہ ہمارا قلم سچ لکھنے کے لیے ہے۔ انہیں قتل ہونا منظور تھا، لیکن قاتل کی طرف داری بالکل گوارا نہ تھی ؎

قتل ہونا ہمیں منظور ہے لیکن راناؔ
ہم سے قاتل کی سفارش نہیں ہونے والی

میاں میں شیر ہوں شیروں کی غراہٹ نہیں جاتی
میں لہجہ نرم بھی کرلوں تو جھنجھلاہٹ نہیں جاتی

میں ایک دن بے خیالی میں کہیں سچ بول بیٹھا تھا
میں کوشش کر چکا ہوں منھ کی کڑواہٹ نہیں جاتی

منور رانا ایک شخص نہیں مستقل ادارہ تھے۔ وہ ہندوستان میں عصر حاضر کے ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے جو اپنی خداداد اپنی صلاحیت سے شعری کائنات میں اپنا مفرد مقام بنانے میں کامیاب رہے۔

منور رانا کو اردو ادب کے لیے کئی ایوارڈ ملے، مثلاً رئیس امروہوی ایوارڈ (۱۹۹۳ء) دلکش ایوارڈ (۱۹۹۵ء) سلیم جعفری ایوارڈ (۱۹۹۷ء) سرسوتی سماج ایوارڈ (۲۰۰۴ء) غالبؔ ایوارڈ ادے پور (۲۰۰۵ء) کبیر سمان ایوارڈ (۲۰۰۶ء) عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ، بنگال اردو اکیڈمی ایوارڈ (۲۰۱۱ء) ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (۲۰۱۴ء) لیکن ۲۰۱۵ء میں انہوں نے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ احتجاجاً واپس کر دیا تھا۔ وہ اردو اکادمیوں، اردو اداروں کے علاوہ ہندی و دیگر زبانوں کے اداروں کی جانب سے بھی ایوارڈ سے نوازے گئے، مثلاً بزم سخن ایوارڈ، میر تقی میرؔ ایوارڈ، شہود عالم آفاقی ایوارڈ، الہ آباد پریس کلب ایوارڈ، امیر خسروؔ ایوارڈ، مولانا ابوالحسن ندوی ایوارڈ، استاد بسم اللہ خاں ایوارڈ، حضرت الماس شاہ ایوارڈ، ایکتا ایوارڈ بھارتی پریشد ایوارڈ، ڈاکٹر ذاکر حسین ایوارڈ اور کبیر ایوارڈ وغیرہ۔

منور رانا کی وفات اُردو شاعری کا ہی نہیں، خود ہماری تہذیب کا بھی ناقابل تلافی خسارہ ہے، وہ اردو شاعری اور تہذیب کے نمائندہ تھے۔ ان کو ہندی اور اردو دونوں اسٹیج پر یکساں پسند کیا گیا، کیوں کہ ان کی شاعری عام لوگوں کی زبان میں ہوتی تھی۔ اردو شاعری میں شاندار جذبات کی بے ریا پیش کش کے لیے وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ ان کے اشعار زندگی کے عروج و زوال کا مرقع اور ادبیت سے بھر پور ہوا کرتے تھے۔ ایسی شخصیات صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ بیشک انہیں ایک سفاک عہد کا معصوم شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے اپنی حقیقی موت سے پہلے زمین کی خوراک ہو جانے کا سراغ یوں دیا تھا ؎

جسم پر مٹی ملیں گے پاک ہو جائیں گے ہم
اے زمیں اک دن تری خوراک ہو جائیں گے ہم

❁❁❁

افسانے

مسرور تمنا

آج پھر جینے کی تمنا ہے

''ہم سے کیا بھول ہوئی جو یہ سزا ہم کو ملی
اب تو چاروں ہی طرف بند ہے دنیا کی گلی''

اس کی آواز میں بے پناہ درد تھا۔ لتا نے چونک کر باہر کی طرف دیکھا، مگر اس سے پہلے کہ وہ گیٹ کھول کر باہر آتی، وہ جا چکا تھا۔

''آمار پوجا ر پھول بھالو باشہ
ہیرے گا چھے تمی کینو پھول تو لونا''

آج وہ ایک بنگلہ گیت گاتے ہوئے گزر رہا تھا۔ لتا اپنا کام چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل آئی:

''اے سنو سنو......'' وہ تیزی سے اس کے قریب پہنچی تو دنگ رہ گئی۔ وہ ایک خوبصورت، وجیہ نوجوان تھا۔ لتا نے دیکھا اس کی حالت کافی خراب وخستہ ہے۔

''چلو میرے ساتھ، تم اس پیڑ کے نیچے بیٹھو، میں تمہارے لئے روٹی لے کر آتی ہوں۔''

''روٹی......'' وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر اس کے ساتھ چلا آیا اور پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔

لتا نے اپنے حصے کی روٹیاں اٹھائیں جو مالکن نے ناشتے کے لئے دیا تھا اور پالک کی سبزی اور اچار بھی ایک کاغذ پر رکھا اور اس کے پاس چلی آئی۔ اس نے خوش ہو کر روٹیاں لیں اور کھانے لگا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

اس کی آواز بہت میٹھی تھی، لتا کھو سی گئی۔

''لتا......اور تمہارا نام؟''

''میرا نام روشن ہے۔'' وہ دلکش انداز میں باتیں کر رہا تھا:

''اپنے بارے میں اور کچھ نہیں بتاؤ گی لتا؟''

''میں پاس کے بنگلے میں کام کرتی ہوں اور دو روز سے تمہارا گیت سن رہی ہوں۔ پہلے تو تم یہاں نہیں تھے؟''

لتا نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

''نہیں بدنصیبی یہاں کھینچ لائی لتا۔ میں کام کی تلاش میں ممبئی آیا تھا کچھ لوگوں نے مجھے لوٹ لیا اور مجھے مار کر ریلوے لائن پر پھینک دیا۔ پتہ نہیں کس بھلے انسان نے میری جان بچائی۔ اسپتال میں آنکھ کھلی تو میری دنیا اندھیری ہو چکی تھی۔ میں اسی وقت مر جاتا تو اچھا تھا۔ میں بہت رویا، بہت تڑپا۔''

''ارے'' لتا نے افسوس سے کہا ''تم اپنے گاؤں واپس چلے جاتے، ماں باپ بھائی بہن ہوں گے نا تمہارے؟''

''نہیں لتا...... ماں باپ نہیں ہیں۔ ایک بھائی ہے جو مجھے آوارہ نکما ہونے کا طعنہ دیا کرتا تھا۔ میں کھیت میں کام جو نہیں کرتا تھا، اس لئے اب میں کیا منہ لے کر جاؤں؟ وہاں میرا بوجھ کون اٹھائے گا، یہاں تو بھیک مانگ لیتا ہوں۔'' وہ رو پڑا۔

لتا نے اسے چپ کرایا اور بولی:

''ایک بات کہوں روشن......تم روز صبح یہاں اس پیڑ کے نیچے آ کر بیٹھ جایا کرو۔ میں تمہارے لئے روٹیاں لاؤں گی۔ تم بھیک مانگتے بالکل بھی اچھے نہیں لگتے۔''

لتا کی آواز میں درد محسوس کر کے روشن تڑپ اٹھا:

''کیا کروں لتا...... میں کوئی کام کرنے کے قابل جو نہیں۔ ٹھیک ہے میں کل ضرور آؤں گا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

مالکن نے لتا کو اور بھی کام سونپے تھے جس کی وجہ سے اس کی تنخواہ میں کافی اضافہ ہو چکا تھا اور کھانے پینے کی پوری چھوٹ تھی، لتا روشن کو زیادہ سے زیادہ کھلانے کی کوشش میں تھی، مگر وہ تو بس چار روٹی ہی میں خوش تھا جو دن بھر کے لئے کافی تھی۔

''تیرے نام ہم نے کیا ہے جیون اپنا سارا صنم۔''
اس کی آواز سن کر لتا باہر آئی۔ آج روٹی کے ساتھ مالک کے کچھ پرانے کپڑے بھی تھے جو مالکن نے اسے کسی غریب کو دینے کو کہا تھا۔ اس نے روشن کو کپڑے تھمائے اور بولی:
''تم ذرا صاف ستھرے رہا کرو۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں کوئی کام دلا دوں؟''
''ارے لتا اس اندھے کو کون کام دے گا؟'' وہ ہنسا تھا، مگر اس کی ہنسی میں درد تھا۔ لتا کی آنکھیں بھر آئیں۔
''کاش روشن...... میں تمہاری آنکھیں واپس لا سکتی۔'' وہ آنسوؤں سے رو پڑی۔
''لتا تم میری اتنی پرواہ کیوں کرتی ہو؟ کوئی بھی تو نہیں میں تمہارا، پھر یہ ناطہ کیسا؟'' اس نے مسکرا کر کہا تو لتا کو لگا جیسے وہ اسے دیکھ رہا ہو، پھر وہ اٹھا اور گاتا ہوا نکل گیا۔

''بڑی دور سے آئے ہیں
پیار کا تحفہ لائے ہیں''

لتا کی آنکھیں بھیگے موسم کی برسات بن گئیں۔ وہ چاہتی تھی کہ انجان اجنبی، اندھا انسان اس کا اپنا ہو جائے۔ وہ اس کا سہارا بننا چاہتی تھی، مگر پتہ نہیں دنیا کی بھیڑ میں وہ کہاں کھو گیا۔ لتا کی بے چین نگاہیں اسے ڈھونڈتی رہیں اور آخر ایک دن وہ اسے مل ہی گیا۔
اس کے اپنے ہی چال کے پاس ایک پیڑ کے نیچے کوئی گٹھری بنا پڑا تھا۔ اس نے لوگوں سے پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ تو کئی دنوں سے یہاں خاموش گم سم پڑا ہے۔
لتا اس کے قریب گئی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ کوئی اور نہیں روشن تھا۔ بیمار، بھوک پیاس سے نڈھال، بخار میں مبتلا۔ لتا اسے اپنے گھر لے آئی اور اس کی دیکھ بھال کرنے لگی۔
لتا بھول گئی کہ وہ ایک انجان اجنبی تھا۔ وہ اس کی سیوا میں لگی رہی اور وہ بار بار کہتا کہ وہ لتا پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔
''اوہ......تو تم مجھے پسند نہیں کرتے؟'' لتا خفا ہو گئی۔
''ارے نہیں لتا......تم تو بہت پیاری ہو......بہت سندر ...... میں تمہیں......من کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں......تم دیوی ہو...... سندرتا کی مورت......''
''تیرے نام ہم نے کیا ہے جیون اپنا سارا صنم''
اس کی آواز فضاؤں میں گونجی تو اچانک ہی ایک بڑی سی کار اس کے چال کے قریب آ کر رُک گئی۔
''واہ کیا بات ہے ہمیں تو آپ ہی کی تلاش تھی۔'' کار والا روشن سے مخاطب ہوا۔
نئی آواز کی تلاش میں جانے کب سے گھوم رہا ہوں اور پھر وہ اس کے ساتھ چلا گیا اور اب وہ ایک کامیاب سنگر بن چکا تھا۔
''اب تو روشن کو اس کی منزل مل چکی ہے۔'' لتا نے سوچا ''پھر وہ اب مجھے کیوں یاد رکھے گا۔ کیا دیتی تھی میں اسے صرف دو روٹی نا؟'' اس نے اپنے تڑپتے دل کو سمجھایا تو دل نے چپکے سے کہا:
''لتا تم اسے پیار کرتی ہو اس وقت سے جب وہ کچھ بھی نہیں تھا، مگر آج اس کے پاس سب کچھ ہے'' اور پھر ایک دن جب کسی نے آ کر خبر دی کہ وہ فلاں اسپتال میں بیمار پڑا ہے تو لتا دوڑتی ہوئی اس سے ملنے جا پہنچی۔
ڈاکٹر اسے اپنے ساتھ اندر لے گئے:
''لتا جی آپ یہاں کھڑی رہیں۔''
تھوڑی دیر بعد روشن اس کے سامنے آ گیا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی اور پھر اس کی پٹی کھولی گئی۔ ڈاکٹر نے کہا:
''روشن بابو اب اپنی آنکھیں دھیرے دھیرے کھولئے۔''
وہ سب سے پہلے لتا کو دیکھنا چاہتا تھا، اس لئے اسے بلایا گیا تھا۔ روشن نے دیکھا اور بے حد خوش ہو کر بولا:
''ارے لتا تم میرے تصور سے بھی زیادہ خوبصورت ہو اور تمہارا من بھی سندر ہے۔ تم سنگ مرمر کی مورت ہو اور میرے جینے کا مقصد بھی۔ سچ کہوں لتا تم سے ملنے سے پہلے جینے کی چاہ نہ تھی، مگر تم نے مجھے جینا سکھایا۔ آج پھر جینے کی تمنا ہے کیا تم ساری زندگی میرا ساتھ نبھا سکتی ہو؟'' اور لتا کی آنکھوں میں بجھتے چراغ دوبارہ روشن ہو اٹھے۔

❋❋❋

محمد طارق

Inamdar House, Kholapur, Dist Amravati - 444802 (M.S.)(Mob. 8055503366)

ببول کا سایہ

اُسے اپنے باپ پر طیش آ رہا تھا۔ باپ کی یہ بات اب اس کے لئے اذیت دہ صدائے بازگشت بن چکی تھی۔

''بیٹا! میں یہ سب تیرے لئے ہی تو کر رہا ہوں۔''

برسوں پہلے باپ کی اس بات کو سن کر وہ خوش ہو جایا کرتا تھا، اتنا خوش کہ باپ سے لپٹ جاتا۔

''ابو! آپ کتنے اچھے ہیں۔''

باپ بھی اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر شدت سے اس کو پیار کرتا تھا۔ آج اسے اپنے باپ کی بانہوں کی گرفت یاد آ رہی تھی۔ اس کے بوسوں کا لمس وہ اپنی پیشانی پر محسوس کر رہا تھا اور اندر ہی اندر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا۔

اُس کی شخصیت کی وہ ساری دیواریں جن کی تعمیر کے لئے اس نے یہ پاپڑ بیلے تھے، اپنی منہ زور خواہشات کا بارہا خون کیا تھا، اپنے آپ کو ترسایا تھا، وہ ساری دیواریں اس کی نگاہوں کے سامنے منہدم ہو گئی تھیں اور وہ خاموش تماشائی بنا بس دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

اُسے اپنے بچپن کا ایک واقعہ آج بھی اچھی طرح یاد تھا۔ کلاس کے کچھ لڑکے اپنے اپنے والد کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔ ہر ایک یہ منوانے پر تلا ہوا تھا کہ ساری دنیا میں ایک اس کے والد سب سے اچھے اور شریف، سب سے زیادہ نیک اور عزت دار ہیں۔ جب اس نے ان کے دعوے سن کر اپنے باپ کے عزت دار اور شریف ہونے کی بات کہی تھی تو تمام ساتھیوں کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ ایک ساتھی تو اس کے سامنے ہاتھ نچا کر اور قہقہے لگا کر کہنے لگا تھا:

''لو سنو! اس کے ابا حضور عزت دار، شریف ہیں ...... ارے! شہر کے دادا ہیں تیرے ابا جان، لوگ اُن سے ڈرتے ہیں، ان کی عزت نہیں کرتے۔''

دوسرے لڑکے نے اس لڑکے کو ڈرایا تھا:

''ارے! ایسا مت بول! تجھے اس کے ابا ماریں گے......''

''میں کیوں ڈروں...... جو سچ ہے وہی تو کہہ رہا ہوں۔ اس کے ابا جان شراب کا دھندا کرتے ہیں، جوئے کا کلب چلاتے ہیں، بتاؤ یہ عزت داروں کے پیشے ہیں کیا؟'' لڑکے نے ڈھٹائی سے کہا تھا۔ تب اُسے بہت برا لگا تھا۔ اُس نے اپنے باپ سے اس لڑکے کی شکایت کی تھی۔ باپ نے اُسے خوب مارا تھا اور لڑکے کے باپ کو دھمکی بھی دے دی تھی:

''میرے بارے میں اگر تمہارے چھوکرے نے دوبارہ کبھی اناپ شناپ بکا تو مجھ سے برا کوئی نہیں...... سمجھا......''

جواب میں لڑکے کے باپ نے نہایت عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی:

''معاف کر دو بھائی...... میرے بیٹے سے غلطی ہو گئی۔ آئندہ وہ ایسی حرکت کبھی نہیں کرے گا۔''

وہ اس وقت بہت خوش ہوا تھا کہ اس کے ابا جان کی کتنی عزت ہے۔ لوگ کتنا ڈرتے ہیں اس کے ابا جان سے، کسی کی کیا مجال کوئی اُن کی طرف انگلی بھی اُٹھائے۔ یہ سوچ کر اس کا سینہ فخر سے پھول گیا تھا، لیکن...... برسوں بعد جب اُس کا شعور بیدار ہو گیا تو اس نے اپنے اور اپنے والد کی حیثیت کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا تھا اور تب اُسے حقیقت کا اندازہ ہو گیا تھا۔

کئی انگلیاں تھیں جو اُسے دل کی آنکھوں سے، اپنے والد کی طرف اُٹھتی دکھائی دی تھیں۔ کئی آنکھیں تھیں جن میں ان کے لئے نفرت کے شعلے دہک رہے تھے اور اُس نے سوچا تھا، میں ان انگلیوں کو جھکا دوں گا۔ میں ان آنکھوں میں اپنے لئے محبت کے دیپ روشن کر دوں گا۔

اپنے کردار سے اپنی اس شخصیت کی تعمیر کروں گا جو میرے والد کی گھناؤنی زندگی کی بدولت داغ دار ہو چکی ہے، حالاں کہ خدا گواہ ہے، میں ان ناجائز افعال سے بہت دور رہا ہوں جوان کے کئے دھرے ہیں۔

جن کے والدین اپنی زندگی بدچلنی میں گزار دیتے ہیں، ان کے لئے وقار اور عزت کا مقام حاصل کرنا کتنا دشوار ہو جاتا ہے، اس کا اُسے بخوبی احساس تھا، اس لئے وہ اپنی زندگی کے راستے پر بہت ہی سنبھل سنبھل کر چلا، پھونک پھونک کر ہر قدم رکھا، کبھی غلطی سے بھی کسی کا دل نہیں دکھایا، کسی کی برائی نہ کی، ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاق کا برتاؤ کیا۔ چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آیا اور بڑوں کی عزت کی۔ راستے سے چلا تو سر جھکا کر نیچی نظریں کئے ہوئے۔

اس نے اس لڑکی کی طرف بھی دیکھنا ترک کر دیا تھا جو اس کی کلاس فیلو رہ چکی تھی، جس کے ساتھ اُس کے بچپن کا معصوم دور گزرا تھا اور نوجوانی کا کبھی نہ بھولا جانے والا کچھ وقت بھی بیتا تھا۔ کالج کے ماحول میں جہاں آئے دن عشق ومحبت کے نئے نئے ناٹک کھیلے جاتے ہیں۔ مالدار، عزت دار، مہذب لوگوں کے شریف زادے اعلیٰ تعلیم کے بہانے گھٹیا درجے کی عیاشیاں کرتے رہتے ہیں، ایسے ماحول میں وہ اس لڑکی کو دل ہی دل میں، نیک نیتی سے چاہنے لگا تھا۔

اُس کا جی تو بہت چاہا تھا کہ وہ اپنی محبت کا جو پھانس کی طرح اُس کے دل کی نرم زمین میں بری طرح پھنسی ہوئی ہے، اظہار کر دے، لیکن وہ ڈرتا تھا کہ کہیں وہ شریف لڑکی اسے غلط نہ سمجھ بیٹھے۔ وہ کسی کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ صرف اس سے کبھی کبھی نصابی موضوع پر تبادلہ خیالات کر لیتی تھی یا ضرورت ہونے پر نوٹس وغیرہ لے لیتی تھی، وہ بھی اس لئے کہ وہ کلاس کے تمام طلبہ میں منفرد تھا، سنجیدہ، با اخلاق۔ لڑکی نے بالمشافہ بلا تکلف اس کی تعریف بھی کی تھی، جسے سن کر اس کا سینہ مسرت سے بھر گیا تھا، سر فخر سے اونچا ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ بچپن میں میرے والد کے کردار سے میرا سینہ اسی طرح پھول جاتا تھا اور سر اونچا، آج میرے وجود کی اُس کیفیت اور اِس کیفیت میں کتنا فرق ہے۔ وہ کیفیت میری اپنی بربادی تھی، میرا زوال اور یہ کیفیت......؟ انہیں، میں اپنی اس کیفیت کے لطف کو گنواؤں گا نہیں، اپنے جذبات پر قابو رکھوں گا، نہیں تو مجھ میں اور کالج کے دیگر لڑکوں میں کیا فرق باقی رہ جائے گا؟''

محبت کا زبان سے اظہار کرنا ضروری بھی نہیں وہ جب دل میں پیدا ہوتی ہے تو اس کا اظہار کردار سے از خود ہو جاتا ہے، اسی لئے وہ لڑکی کو کالج کا دور ختم ہونے کے بعد بھی کبھی اس کے گھر کی بالکونی میں کھڑا ہوا پاتا، وہ اسے دیکھا کرتی تھی اور وہ سر جھکا کر گزر جاتا تھا۔ اس کا جی بار ہا چاہا کہ وہ کچھ وقت کے لئے نہ سہی، پل دو پل کے لئے ہی رک جائے اور نظر بھر کے اُسے دیکھ لے، مگر پھر فوراً ہی اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے چاروں طرف کے ماحول کی بہت ساری آنکھیں نکل آئی ہیں اور اسے شک کی نگاہوں سے تک رہی ہیں۔

وہ ایک دم محتاط ہو جاتا، سوچتا، میں ایک بدچلن باپ کا بیٹا ہوں، لوگ میری ذرا سی لغزش برداشت نہیں کر پائیں گے۔ وہ مجھے بدنامی کے ایسے گڈھے میں پھینک دیں گے، جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔ ابھی ابھی تو لوگوں کی انگلیاں جھکی ہیں۔ ابھی ابھی تو ان کی نگاہوں میں جو میرے لئے نفرت کے شعلے دہک رہے تھے، بجھے ہیں۔ ابھی ابھی تو وہ مجھے ایک اچھا انسان سمجھنے لگے ہیں۔

میں ایک اچھے انسان کی طرح سماجی اور مذہبی اصول کے تحت اس کے لئے اپنا پیام بھیجوں گا۔ اس کے والد بہت شریف النفس ہیں، یقین ہے وہ میرا پیام منظور کر لیں گے۔

ایک دن اُس نے اپنی والدہ کو بڑی منت سماجت کر کے اس بات کے لئے راضی کر لیا کہ وہ اس لڑکی کے لئے اس کا پیام لے جائیں۔ وہ بیٹے کی خواہش کے تحت پیام لے گئیں، مگر مرجھایا ہوا چہرہ لیے واپس آئیں اور برآمدے میں رکھی کرسی پر سر جھکا کر بیٹھ گئیں۔

''امی......!'' وہ ماں سے مخاطب ہوا۔

ماں نے سر اُٹھا کر ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ اُسے اپنے لختِ جگر کا چہرہ دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ ''کیا ہوا امی جان......؟''

''بیٹا، کیوں ذلیل کیا تو نے مجھے بھیج کر؟ معلوم ہے کیا کہہ رہے تھے وہ لوگ؟ ان کے رشتے دار، پڑوسی، سب کے سب......'' ماں کی

(بقیہ ص ۶۹ پر)

انشائیہ

طبیب احسن تابش
Iqrab Masjid Complex, B-5, Main Road, Ranchi - 834001 (Mob. 9534340212)

قطار

آج زندگی کا کون سا شعبہ ہے، جہاں قطار میں لگے بغیر کوئی کام ہو جاتا ہو۔ مجھے اچھی طرح یادنہیں کہ میرا کون سا کام بغیر قطار میں لگے ہوا ہے۔ ہاں ! یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے قطار میں لگنا کب سے شروع کیا۔

میں جب گاؤں سے ایک کیلومیٹر دور مکتب جاتا تھا تو ہمارے ساتھ گاؤں کے اور دوست بھی ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ مکتب پہنچنے میں تاخیر ہوتی تو مولوی صاحب قطار میں کھڑا کر دیتے اور پھر باری باری سے ہم لوگوں کی خاطر تواضع ''تنبیہ الغافلین '' سے کرتے تاخیر کی وجہ یہ نہیں کہ ہماری مائیں ہم لوگوں کو وقت پر ناشتہ بنا کر نہ دیتی تھیں، بلکہ وجہ یہ ہوتی تھی کہ راستے میں ملنے والے بیر اور امرود کے درختوں پر ہم سب ڈھیلے اور پتھر پھینکتے تاکہ دو چار بیر اور امرود ہم لوگوں کے ہاتھ لگ جائیں۔ پیڑ میں پھل لگے ہوں اور اس پر پتھر نہ چلے یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ بشیر بدر نے شاید اسی پس منظر میں یہ شعر کہا ہے ۔

جہاں پیڑ پر چار دانے لگے
وہیں پتھروں کے نشانے لگے

قطار میں لگنے کی دوسری وجہ یہ ہوتی کہ جس بچے کو سبق یاد نہ ہوتا، مولوی صاحب قطار میں کھڑا کر دیتے۔ ان خوش نصیب بچوں میں میرا بھی نام ہوتا اور میں بھی قطار میں لگ جاتا۔

جب کچھ بڑا ہوا تو مکتب سے نکل کر اسکول اور پھر کالج میں آیا۔ وہاں کچھ دوستوں نے کہا: ''لائن مارو گے؟'' میں نے کہا ''یہ کیا ہوتا ہے؟'' دوستوں نے سمجھایا تو میں نے حامی بھر لی، مگر کچھ دوست جو بہت اسمارٹ بنتے تھے، ان لوگوں نے کہا: ''اس کو کون لائیک (Like) کرے گی۔ دیکھتے نہیں، اونٹ کی طرح گردن، ناک ہمالیہ پہاڑ، گال دھنسے ہوئے یہ کوئی صورت ہے؟'' مجھے ان لوگوں نے خود سے الگ کر دیا۔ میں نے بھی تہیہ کرلیا کہ میں اپنے ان عیبوں کو جلد دور کرلوں گا۔

ایک بزرگ جو مفت میں مشورہ دیتے تھے اور جس کو بھی مشورہ دیتے وہ اس میں کامیاب ہو ہی جاتا تھا، میں نے ان سے کہا:

''محترم مجھے ایک مشورہ دیجئے۔''

''پہلے مسئلہ بتاؤ تب تو مشورہ دوں گا۔'' میں نے کہا: ''میرا قد بہت لمبا ہے، ناک لمبی ہے، گال دھنسے ہوئے ہیں۔ یہ سب عیب ایک ساتھ دور ہو جائیں ایسا نسخہ بتایئے۔'' انہوں نے کافی غور کرنے کے بعد کہا: ''ایک نسخہ ہے، جو ایک ہی تیر سے تین نشانے لگ جائیں گے۔''

میں نے خوشی سے اچھلتے ہوئے پوچھا: ''جلدی بتایئے، وہ نسخہ کیا ہے؟'' انہوں نے کہا تم عشق کرنا شروع کردو، اور چھپ چھپا کر نہیں، بلکہ دن کے اجالے میں تاکہ تمہارا عشق پوشیدہ نہیں رہے۔ تمہارا عشق جتنا عیاں ہوگا تم اتنے ہی جلد کامیابی کی طرف آؤ گے۔ اگر چھپ کر کرو گے تو کامیابی ملے گی، مگر وقت کافی برباد ہوگا، اس لئے تم آج ہی سے اس کام کا شبھ آرمبھ کردو۔

میں نے کالج کی ہی ایک لڑکی سے عشق کا اظہار کردیا۔ مجھ پر وہ آگ بگولہ ہوگئی، میں نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ ۔

چودہویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو
جو بھی ہو تم خدا کی قسم لاجواب ہو

اس نے اپنے دوستوں سے میری وہ مرمت کرائی کہ مجھے نانی یاد آگئی۔ میں جب اسپتال پہنچا تو وہاں مجھے قطار میں کھڑا کر دیا گیا، پوچھا تو پتہ چلا کہ اندر دو عاشقوں کی مرہم پٹی ہو رہی ہے۔ جب وہ لوگ نکلیں گے تب آپ کا نمبر آئے گا۔ دونوں لڑکے اندر سے نکلے تو میں حیران و ششدر رہ گیا۔ وہ دونوں کوئی اور نہیں میرے دوست تھے۔ اپنا معاملہ تو سمجھ میں آرہا تھا، مگر ان کے معاملات پر غور کرتا ہوا اندر گیا مرہم پٹی ہوئی اور میں

سیدھا بزرگ کے پاس گیا اور میں نے اپنی شکل دکھائی، تو وہ خوشی سے جھوم اٹھے۔ مجھے ان کی خوشی کا راز سمجھ میں نہ آیا اور میں نے دل ہی دل میں خوب بددعائیں دی، اور کہا: ''آپ نے میری حالت ایسی کرادی اور آپ کو ہنسی آرہی ہے۔'' انہوں نے کچھ کہا نہیں سیدھے آئینہ لا کر مجھے دیا اور کہا:

''دیکھو یہ ہے نسخہ کیمیا - ایک تیر سے تین نشانے۔''

میں نے حیرت کا اظہار کیا کہ یہ کون سا طریقہ ہوا کسی کو ذلیل کرنے کا؟ انہوں نے کہا: ''میں نے تم کو رسوا کرنے کے لیے ایسا نہیں کیا، بلکہ تمہارے تینوں عیب ایک ساتھ ختم ہو گئے، گال پھول گئے۔ ناک نیچی ہو گئی اور قد بھی پست ہو جائے گا۔''

میں نے کہا: ''وہ کیسے؟''

انہوں نے کہا: ''جب کالج جاؤ گے اور دوستوں کو اس کی خبر ہوگی تو تمہاری ناک جو کھڑی تھی کہ تم بہت شریف ہو تمہاری ناک خود بہ خود پست ہو جائے گی اور شرم کے مارے تم اتنے پانی پانی ہو جاؤ گے کہ سماج میں تمہارا قد کم ہو ہی جائے گا۔ کوئی ڈاکٹر اس سے اچھا نسخہ لکھ ہی نہیں سکتا۔'' قطار میں لگنے کے لائق بننے کا مجھے تلخ تجربہ ہو گیا۔

میں نے ایک بزرگ سے مشورہ کیا کہ کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ لوگ مجھ سے ملنے کے لئے قطار میں لگنا شروع کر دیں۔ انہوں نے کہا: ''جب تک انسان کے اندر کوئی کمال نہیں ہوتا۔ کوئی کسی سے کیوں ملے گا؟ اپنے اندر کمال پیدا کرنا ہو گا۔''

میں نے کہا: ''میں اپنے اندر کون سا کمال پیدا کر سکتا ہوں۔ کھلاڑی تو بن نہیں سکتا۔ ہیرو بن نہیں سکتا، بڑا رہنما بن نہیں سکتا، شاعر و ادیب بن نہیں سکتا۔''

بزرگ نے کہا: ''ایک کمال اپنے اندر پیدا کر سکتے ہو۔ تم فائٹر (Fighter) بن سکتے ہو۔ اس میں زیادہ علم کی بھی ضرورت نہیں۔ بازو میں طاقت ہونی چاہئے۔''

میں نے کہا: ''بازو میں طاقت پیدا کرلوں گا۔''

''تو بس تم آج سے ہی اس کی شروعات کردو۔''

میں نے کہا: ''یہ بالکل چالو آئیٹم (Item) ہے۔ بات بات پر تو لوگ فائیٹنگ شروع کر ہی دیتے ہیں۔ میں بھی اب اس پر زیادہ دھیان دوں گا۔''

گھر آیا بیگم نے کہا، آج کل کہاں رہتے ہیں جو صبح سے جاتے ہیں تو شام کو ہی لوٹتے ہیں۔ بیگم کی اتنی بات ختم ہوتے ہوتے میں کپڑا تبدیل کر چکا تھا۔ بیگم اپنی بات ختم کر کے باورچی خانے کی طرف جانے لگیں، ان کی پشت ٹھیک میرے نشانے پر تھی۔ پشت پر ایک فائٹ مارا وہ کراہ کر گرتے گرتے بچیں۔ میں نے سنبھالا، انہیں کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ اچانک میں نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے ہی کہا: ''زور سے لگ گیا کیا؟ جان من، میں اصل میں فائٹر بن رہا ہوں۔ مجھ پر فائٹر بننے کا جنون سوار ہے، اس لئے میں نے پہلی پریکٹس تم پر ہی کر دی۔''

''فائٹر بننے کے لیے تمہیں استاد کی ضرورت تو پڑے گی ہی ابھی میں چاروں بھائیوں کو بلاتی ہوں۔''

''نہیں! نہیں! اتنی جلد بازی نہیں ہے ان لوگوں کو ابھی مت بلاؤ، وقتاً فوقتاً میں تم پر ہی پریکٹس کرلوں گا۔ جب دال میں نمک زیادہ پڑ جائے گا یا سبزی میں مرچ زیادہ ہو جائے گی، بلا سبب نہیں، اسباب میں خود تلاش کرلوں گا۔''

ایک جنازہ جا رہا تھا جنازہ کے پیچھے ایک کتا تھا اس کے پیچھے بہت سے لوگ قطار میں چل رہے تھے۔ میں بھی بغیر سوچے سمجھے قطار میں لگ گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ جس عورت کی موت ہوئی ہے اسی کتے کے کاٹنے کی وجہ سے ہوئی ہے، اس لئے اس کتے کو لینے کے لیے لوگ قطار میں لگے ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا ''نہیں ابھی مجھے اس کتے کی ضرورت نہیں ابھی مجھے اپنی بیگم کی ضرورت ہے، مجھے فائٹر جو بننا ہے۔''

بیگم گیس کا سلنڈر لے کر قطار میں کھڑی ہوں گی اور میں یہاں مضمون لکھ رہا ہوں۔ ہم بھی کتنے پاگل ہیں۔ آپ بھی کسی قطار میں لگے ہیں تو آج کا اخبار پڑھئے تاکہ وقت پاس ہو اور آپ کا نمبر بھی جلد آجائے۔ میں چلا قطار میں لگنے۔ ''ارے یہاں تو بہت لمبی قطار ہے۔''

''لمبی ہے تو کیا ہوا، سلنڈر لینا ہے تو قطار میں تو لگنا ہی پڑے گا'' پیچھے سے نسوانی آواز آئی۔ پلٹ کر دیکھا تو وہی لڑکی تھی جس نے میری مرمت کروائی تھی، مگر وہ اب ایک عورت بن چکی تھی۔ میں نے بیگم کے کان میں گھر جانے کو کہا اور میں سلنڈر کے سامنے ہی قطار میں لگ گیا۔ ❁❁

منظومات

شکیلؔ ہاشمی

Sulemanganj, Sasaram 821115 (Mob. 8409179513)

مناجات

وقت بگڑا ہے بہت آج بنا دے یارب
تیرہ بختی کی سزا ساری مٹا دے یارب

تیری قدرت کا کرشمہ ہے ازل سے جاری
اپنی رحمت کی جسے چاہے ہوا دے یارب

میری ہستی کو میسر ہو عنایت تیری
اب نہ بکھروں میں کبھی ایسا بنا دے یارب

میں بھی کچھ کرکے گزر جاؤں سرِ راہِ فنا
حوصلہ میرے عزائم کا بڑھا دے یارب

مجھ سے دیکھی نہیں جاتی ہے مری تیرہ شبی
میری قسمت کی لکیروں کو ضیا دے یارب

کوئی تعبیر کی صورت تو نکل آئے شکیلؔ
ایسا پلکوں پہ کوئی خواب سجا دے یارب

❀❀❀

مشتاقؔ سیوانی

New Khajoor Banna, Patna (Mob. 9304693513)

نعت پاک

ہر وصف کمال مرے مصطفیٰ میں ہے
رحمت خدا کی دامن خیر الوریٰ میں ہے

موجِ بہارِ خلد بریں بھی ہے وجد میں
خوشبوئے زلف عنبریں بادِ صبا میں ہے

قرآں بھی کہہ رہا ہے یہ اپنی زبان سے
رب کی رضا حبیب خدا کی رضا میں ہے

عظمت رسولِ پاک کی اقصیٰ سے ہے عیاں
نبیوں کا اک ہجوم ہے جو اقتدا میں ہے

خوشبو برائے چین و سکوں ، اطمینان جاں
دامانِ شاہِ کون و مکاں کی ہوا میں ہے

رخسارِ مصطفیٰ پہ ہیں زلفیں جھکی ہوئیں
ہے شمس زیر ابر ، قمر بھی گھٹا میں ہے

مشتاقؔ ایک رات رہے تھے وہاں حضور
اک روشنی سی آج بھی غارِ حرا میں ہے

❀❀❀

نیازؔ جیراجپوری

67, Jalandhari, Azamgarh - 276001 (Mob. 9935751213)

روشن اندھیرے

میں حسابِ دولت زخم تمنا کیا کروں
زندگی یوں ہی گزرتی ہے دیارِ ہجر میں
کوئی دَر آیا تھا دِل میں آنکھوں سے ہوتا ہوا
ساتھ جینے اور مرنے کی قسم کھاتا ہوا

نیندوں کی خوشبو معطر جن کو رکھتی تھی کبھی   کرچیاں ٹوٹے ہوئے خوابوں کی ہیں اُن آنکھوں میں
سرخ راتیں اور نیلے دِن مری تقدیر ہیں   بے بسی ، تنہائی ، رنج و غم مری جاگیر ہیں
ذہن و دِل میں شور سناٹے مچاتے ہیں بہت   مضطرب آوازوں کے سائے بلاتے ہیں بہت

اجنبی بن کر ہوا جب دُور کوئی آشنا
یوں لگا جیسے وہ اپنے ساتھ سب کچھ لے گیا
غم غلط کرتے ہوئے کیسے کہوں کہ کیا ہوا
گھپ اندھیروں میں سراغِ روشنی مجھ کو ملا

اور تو کچھ بھی نہیں اب پاس میرے اے نیازؔ   ہاتھ میں میرے قلم ہے جو کبھی رُکتا نہیں
میں رواں رکھتے ہوئے اِس کو کبھی تھکتا نہیں   میری سوچوں میں چمکتے رہتے ہیں شمس و قمر
جن کو کاغذ پر سجاتا رہتا ہوں شام و سحر   رشک جن کو دیکھ کر اپنے پرائے کرتے ہیں

غوطہ زن رہتا ہوں اُس بحر تخیلات میں
لوگ جس میں ڈھونڈتے اور پاتے ہیں لعل و گہر

❀❀❀

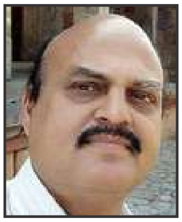

سلیم انصاری

HIG-3, Anand Nagar, Adhartal Jabalpur - 482004 (Madhya Pradesh)
(Mob. 7070135643)

دو نظمیں

اعتراف

میں اپنی نظموں کی بے ثباتی سے آشنا ہوں
میں جانتا ہوں
کہ میرے الفاظ بے صدا ہیں
مجھے خبر ہے
کہ زخم خوردہ ہیں میرے جذبے
مجھے پتہ ہے
کہ میرے لہجے کی آگ سے کوئی اب تک جلا نہیں ہے
یہ سچ بھی پیش نظر ہے میرے
کہ میری نظموں سے آج تک انقلاب آیا نہیں ہے کوئی
میں اپنی نظموں کی بے ثباتی سے خوب واقف ہوں
پھر بھی تخلیق کا یہ عمل ضروری بہت ہے مجھ کو
کہ میری نظمیں ہی
میرے اندر کی کشمکش کے فشار سے
بچ نکلنے کا راستہ ہیں

❁❁❁

یہ سچ بھی......

بہت دکھ ہوا
آج وہ راستے میں
مجھے دیکھ کر بھی نہ ٹھہرا
نہ بولا، نہ وہ مسکرایا
نہ اس نے مری عافیت ہی طلب کی
نہ بچوں کو اپنی دعاؤں سے، شفقت سے اس نے نوازا
بہت دُکھ ہوا
اس نے برسوں پرانے مراسم کی دیوار ڈھادی
مجھے ایک لمحے کو ایسا لگا
جیسے تہذیبی قدروں کو ہی لوگ
مسمار کرتے چلے جارہے ہیں
مگر میں نے سنجیدگی سے جو سوچا
تو یہ سچ بھی روشن ہوا ہے
کہ میں بھی تو
دنیا سے بیزار سا ہو گیا ہوں

❁❁❁

غزلیں

ڈاکٹر حافظ کرناٹکی

"Darul Hafiz" Jai Nagar, 1st Cross, Shikaripur,
Dist. Shemoga, Karnataka - 577427 (Mob. 9900832077)

بڑھاپے میں عبادت یاد آئی
جواں حوروں کی جنت یاد آئی

ملی بیوی سے نفرت جب مسلسل
مجھے ماں کی محبت یاد آئی

اکیلا تیرے غم میں جی رہا ہوں
خوشی میں تیری شرکت یاد آئی

بزرگی میں لگی ٹھوکر تو مجھ کو
جوانی کی شرارت یاد آئی

کسی ماتھے پہ دیکھا جب پسینہ
مجھے اپنی مشقت یاد آئی

اُجالوں میں چلے آئے تو ہم کو
اندھیروں کی حراست یاد آئی

دُکھوں نے گھیرا جب چاروں طرف سے
تو بد حالوں کو راحت یاد آئی

ہوا جب سرنگوں جدت کا حافظ
وہی شانِ روایت یاد آئی

❁❁❁

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

"Nomani Manzil" H.No. 4/704, J-24, Hamdard Nagar-B
Jamalpur, Aligarh -202002 (Mob. 9897820777)

بھیڑ میں کون ہیں ، کیا جانوں میں
کاش کہ خود کو ہی پہچانوں میں

جب کہ تجھ سا نہیں دنیا میں کوئی
اپنے جیسا بھی کسے مانوں میں

اے مرے گوہر یکتا ، کب تک
خاکِ دنیائے طلب چھانوں میں

خاک انجام ہے ہستی کا تو پھر
خاک کیوں خود کو نہ گردانوں میں

ساری تصویریں چھپا کر رکھ دوں
پھر تصور کی ردا تانوں میں

سب انہیں باتوں کو دہراتے ہیں
کس کی باتوں کا برا مانوں میں

زندگی اُس پہ فدا کی ہے رئیسؔ
موت کیا چیز ہے ، کیا جانوں میں

❁❁❁

ندیمؔ جعفری

"Bazm-e-Nadeem" Gaya - 823001 (Mob. 7368024623)

غزلیں

کام کرتا ہے جگ ہنسائی کا
سر میں سودا تھا خود نمائی کا
جس نے کاٹی ہے عمر وحشت میں
اس کو دعویٰ ہے پارسائی کا
اب قیامت بھی اور کیا ہوگی
بھائی کرتا ہے قتل بھائی کا
گھر کی بربادی کا سبب ہے جو
دیتا ہے وہ بیاں صفائی کا
بیچ ڈالا شراب نوشی میں
جو بھی تھا باپ کی کمائی کا
پرلے درجے کا ہے وہی رہزن
چوغہ پہنے جو ہائی فائی کا
کس طرح گھر میں اب رہوں میں ندیمؔ
وقت اب آگیا جدائی کا

❁❁❁

مجھ کو تو چھوڑ کر گئی بس ہے اسی کا غم
اب تک ستا رہا ہے تری بے رخی کا غم
ملک عدم چلی گئی اس کا ملال کیا؟
سب کو رُلا رہا ہے تری رُخصتی کا غم
میں لاکھ پوچھتا رہا وہ کچھ نہ کہہ سکی
ہر لمحہ کھا رہا ہے اسی خامشی کا غم
سادہ لباس ، اعلیٰ صفت ، سادہ لوح تھی
صبح و مسا کریں ہیں اسی سادگی کا غم
میرے پڑوس میں جو بہت بدمزاج تھی
ہر ایک دل کو ڈس گیا اس دل جلی کا غم
وہ خود بھی اک حسین تھی اور تھی بہت خلیق
سب کو رُلا رہا ہے اسی دلبری کا غم
اب تک بنا سکا نہ کوئی آشیاں ندیمؔ
ڈستا ہے ہر گھڑی اسی کم مائیگی کا غم

❁❁❁

مطالع مشاہیر

غفلت میں کٹی عمر ، نہ ہوشیار ہوئے ہم
سوتے ہی رہے آہ نہ بیدار ہوئے ہم (راسخؔ)

شباب بحر جہاں میں اپنا فقط مثل حباب دیکھا
نہ جوش دیکھا، نہ شور دیکھا، نہ موج دیکھی، نہ آب دیکھا (داغؔ دہلوی)

تجھے تسکین دل پایا ، تجھے آرامِ جاں پایا
نہاں بھی ہے تو کیا، تجھ کو جہاں ڈھونڈا، وہاں پایا (محمد علی جوہرؔ)

مکان دل میں ہے کس کا گزر نہیں معلوم
یہ بے خودی ہے کہ گھر کی خبر نہیں معلوم (امیرؔ مینائی)

خورشید دلدار نگری
Daldari Nagar, Ghazipur (Uttar Pradesh) (Mob. 9186507341)

غزلیں

رہِ وفا میں وہ کانٹے بچھا کے دیکھتے ہیں
قدم قدم پہ مجھے آزما کے دیکھتے ہیں

بہا بہا کے پسینہ کسان محنت سے
زمیں سے چاند ستارے اُگا کے دیکھتے ہیں

عجیب لوگ ہیں جو میرے اضطراب کا رقص
تمام رات مرا دل جلا کے دیکھتے ہیں

وہ آنے والے ہیں برسات کے مہینے میں
ابھی سے راہ ، نگاہیں بچھا کے دیکھتے ہیں

تلاشِ دید کرے کوئی ، ہم تو شام و سحر
دیارِ قلب میں جلوے خدا کے دیکھتے ہیں

دئے جلاتے ہیں دوشِ ہوا پہ ہم پیہم
وہ اور ہوں گے جو تیور ہوا کے دیکھتے ہیں

دَرِ صنم پہ سنورتی ہے زندگی خورشیدؔ
یہ بات ہے تو چلو سر جھکا کے دیکھتے ہیں

❀❀❀

درد میں ڈوبی ہوئی شام و سحر مانگے ہے
دل بھی حساس ہے گردش کا سفر مانگے ہے

جس کو لے جائے بہا کر وہ اُمڈتا سیلاب
شوقِ دیدار وہی ریت کا گھر مانگے ہے

درد کی جھیل میں اک عمر بتانے والا
دل بھی کیا خوب ہے اشکوں کا نگر مانگے ہے

عارضِ حسن کو گل رنگ بنانے کے لئے
زخم دل آج وہی خونِ جگر مانگے ہے

قتل کے بعد وہ دیتا ہے سراسر دھوکا
میرے جینے کی دعا اب وہ اگر مانگے ہے

بے وفاؤں سے وفا مانگی ہے خورشیدؔ نے آج
ظلمت شب سے کوئی جیسے سحر مانگے ہے

❀❀❀

اشعارِ زیبا

جب کہا وصل کو اُن سے تو کہا جھنجھلا کر
ہم کو جس کام سے نفرت ہے وہ کیوں کر ہوگا (آزادؔ بریلوی)

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی بھی ہے
مے کشی کا لطف کیا ہے جب گھٹا چھائی نہ ہو (عاصیؔ)

چمک ستاروں کی بدنما ہے، فروغ بجلی کا ناروا ہے
فضائے عالم پہ چھا گیا ہے جمال کس کا، شباب کس کا (قدسیؔ)

حسینانِ جہاں جتنے ہیں، سب ہیں سنگ دل صاحب
سمجھتے ہیں جسے ہم نرم ، وہ پتھر نکلتے ہیں (فوقؔ)

غزلیں

شمسی قریشی

Moh. Usmanpur, P.o. Jalalpur,
Ambedkar Nagar- 224149 (Mob. 9565059506)

کیا جانے کوئی اُن کے کف پا کا نوشتہ
سب گرد ، ثریا ہو کہ سدرہ کا نوشتہ

اِترائے کہ اٹھلائے ، بہے تیز کہ اُچھلے
جھکنا ہی سر بحر ہے دریا کا نوشتہ

پیاسے ہی گئے کتنے سرابوں میں بھٹکتے
بس مکر ہے ، دھوکا ہے یہ صحرا کا نوشتہ

سب خواب ہیں تعبیر کسی کی بھی نہیں ہے
کیسا ہے عجب دشت تمنا کا نوشتہ

کیسے یہ کہیں ہم کہ شباب آیا نہیں پھر
ہے سامنے یوسف کا زلیخا کا نوشتہ

ہونٹوں سے جو لگ جائے ترے ہاتھوں سے مس ہو
اللہ رے اُس جام کا ، مینا کا نوشتہ

مہ رشک کرے ہے تو قلم فخر کرے ہے
خود کرکے رقم اُس رُخ زیبا کا نوشتہ

جب وقت پڑے جھوم کے سر، دار پہ رکھ دے
شمسی ہے کہاں یہ سگ دنیا کا نوشتہ

❀❀❀

عمران عظیم

B-322, Gali No.5, Mandawali Fazalpur,
Delhi - 110092

کہا کچھ نہیں ہے سنا کچھ نہیں
اکٹھے ہیں سب ، ماجرا کچھ نہیں

جو کل تھا ابھی تک وہی ہے یہاں
پرانا ہے سب کچھ ، نیا کچھ نہیں

کہاں سے صدا آئی کانوں میں یہ
زباں چپ ہے ، شکوہ گلہ کچھ نہیں

توقع نہ رکھو مری ذات سے
مرے پاس آخر بچا کچھ نہیں

بہکنے کا الزام آیا ہے کیوں
نشہ ہم نے آخر کیا کچھ نہیں

یہاں آنا جانا بدستور ہے
یہاں بھیڑ کیوں ہے ہوا کچھ نہیں

مرے دل نے کیسے سنا ہے میاں
تری دھڑکنوں نے کہا کچھ نہیں

کوئی فن بھی آتا نہیں ہے عظیم
تمہاری ادا بھی ادا کچھ نہیں

❀❀❀

ظفرؔ صدیقی

Garhi Peer Khan, Pasandh Bagh, Thakur Ganz, Lucknow - 226003
(Mob. 9839666203)

غزلیں

جانے کتنوں کا خواب ہو جائے
تو اگر بے حجاب ہو جائے

تم لگا دو جو ہاتھ پانی کو
تو یہ پانی شراب ہو جائے

آپ سا کاش سادگی کا ہنر
ہم کو بھی دستیاب ہو جائے

اور بھی تم حسین لگنے لگو
کاش رُخ پر نقاب ہو جائے

ظلم ڈھاتا ہے مفلسوں پر جو
اُس پہ نازل عذاب ہو جائے

جانے رُک جائے سانس کب یہ ظفرؔ
تیرا میرا حساب ہو جائے

❁❁❁

دور رہ کر نہ تپش اور بڑھائی جائے
میرے ہونٹوں کی کبھی پیاس بجھائی جائے

اپنی مٹی کے وفادار ہیں غدار نہیں
ان کو یہ بات بھلا کیسے بتائی جائے

آسمانوں کو اُٹھا رکھا ہے سر پر میں نے
ایسی تہمت نہ مرے سر پہ لگائی جائے

میری آواز پہ پہرے ہیں جہاں والوں کے
اس طرح کیسے غزل ان کو سنائی جائے

جو بھی دیوار نظر آئے ظفرؔ نفرت کی
ایسی دیوار چلو بڑھ کے گرائی جائے

❁❁❁

آنکھیں

کن نیندوں اب سوتی ہے اے چشم گریہ ناک — مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا (میرؔ)
آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا — اُس پہ کھل جائے کہ مجھ کو حسرت دیدار ہے (غالبؔ)
آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا — ہے حسرتِ پابوس نکل جائے تو اچھا (ذوقؔ)
ہو نہ بینا تو پھر فرق کیا ہے — چشم انساں و چشم نرگس میں (حالیؔ)
میں رازِ دل چھپاؤں پر چھپا رہنے بھی دے — جان کی دشمن یہ ظالم آنکھ للچائی ہوئی (امیرؔ مینائی)
فانیؔ جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا — ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے (فانیؔ)
دن میں ہم کو دیکھنے والو، اپنے اپنے ہیں اوقات — جاؤ تم نہ اِن خشک آنکھوں پر، ہم راتوں کو رو لیتے ہیں (فراقؔ)

کتابوں کی دنیا

نام کتاب	:	ناشاؔداورنگ آبادی کی فکری جہتیں	
مرتب وناشر	:	محمد حسنین انصاری	
اشاعت	:	۲۰۲۳ء	
صفحات	:	۲۳۲	قیمت : ۳۰۰روپے
مبصر	:	ڈاکٹر آصف سلیم	

ناشاؔد اورنگ آبادی کے فن، شخصیت اور ان کے خاندانی احوال کے تعلق سے محمد حسنین انصاری کی کتاب بنام ''ناشاؔداورنگ آبادی کی فکری جہتیں''اس اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل معلوم ہوتی ہے کہ اس میں ناشاؔداورنگ آبادی سے تفصیلی وابستگی کی خوب تر کاوشیں کی گئی ہیں۔متذکرہ کتاب کی کیفیت اجاگر کرنے چلا ہوں تو اس عالم میں ناشاؔد صاحب شدت سے یاد آرہے ہیں جن کے تخلص کے معنوی حصار سے بالکل متضاد ان کے شخصی انداز واطوار تھے۔یعنی وہ ہمہ دم شاد ہی شاد تھے۔ گورنمنٹ اردو لائبریری، پٹنہ ہو یا بہار اردو اکادمی پٹنہ یا کسی دیگر مقام پر آراستہ مشاعرہ کا اہتمام ہو، مجھے یاد نہیں کہ ناشاؔداورنگ آبادی سے ملتے ہوئے میں نے ان کے چہرے پر کبھی افسردگی کا رنگ دیکھا ہو۔ان کے خوش وخرم رہنے کے عالم کی بابت اثبات میں عمومی طور پر اتفاق ہے۔ متذکرہ کتاب میں ہی دیکھئے کہ اردو کے معتبر نقاد وہاب اشرفی کے ساتھ ششی ٹنڈن، ساحؔر داؤدنگری اور شمع ناسمین نازاؔں وغیرہ نے اس سمت کے تخلیق کردہ ان کے ایک شعر کو بطورِ خاص اظہارِ خیال کے ذیل میں پیش کرنا ضروری خیال کیا ہے۔

ہزاروں غم ہیں اے ناشاؔد لیکن شاد رہتا ہوں
کٹی ہے عمر اپنی یونہی ہنسنے اور ہنسانے میں

ناشاؔد اورنگ آبادی کے تعلق سے اس کتاب میں ''پیش لفظ'' کے تحت ۳۴صفحات مختص کئے گئے ہیں جہاں سادہ و سہل لہجہ میں محمد عین الحق ناشاؔد اورنگ آبادی کے سلسلے کے مشمولہ بیس مضامین کا مختصراً تعارف پیش کیا گیا ہے۔مرتب کا ''پیش لفظ'' یوں ایک سلیقہ مندانہ روش کی صورت معلوم ہوتا ہے کہ وہاں تمام مضمون نگاروں کے تعارف کے ساتھ ان کے مضامین کی اہم تلخیص کی شمولیت کا سامان کیا گیا ہے جو قاری کی کتاب کے تئیں اصل معاملات سے راہِ طوالت کے بغیر بھی مختصراً وابستگی کے اعتبار سے بہر حال مدد و معاون ہے۔ یہاں مرتب نے اپنی کتاب کی غرض و غایت کے ساتھ ناشاؔد اورنگ آبادی کی شخصیت و شعریات کے تعارف کے تعلق سے عین خاکساری کی راہ چلتے ہوئے بڑے اختصار سے بڑا کام لیا ہے۔

ناشاؔداورنگ آبادی کی فکری جہتیں اجاگر و متعین کرنے کے عمل میں مضمون نگاروں کے تمام مضامین کی نوعیت یہ ہے کہ وہاں صدق دل سے ناشاؔداورنگ آبادی کی حیات و ملازمت کے قصوں سے گزرتے ہوئے ان کے شعری کمالات پر ممکنہ حد تک روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے اور اس عمل میں رنگ رنگ کے موضوعات پر مبنی ان کے خاصے اشعار ملاحظے میں چلے آتے ہیں۔ اصلاً اس حوالے سے ان کی وسعت نظر کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ زبان اردو سے محبت کے تعلق سے ناشاؔد اورنگ آبادی کا شعر ہے۔

فرض سمجھ کر خدمت اردو کرتا آیا ہوں ناشاؔد
مجھ کو اس کی فکر نہیں کچھ، کیا کھویا، کیا پایا ہے

وہ اصناف ادب کا رُخ کرتے ہیں تو قصہ و ناول و افسانہ کے مقابلے اشعار کو مزید پر اثر قرار دیتے ہیں۔

قصہ ہو ، کہانی ہو ، فسانہ ہو کہ ناول
اشعار سی پیدا وہ حرارت نہیں کرتے

خود اپنی غزلوں کے تعلق سے بڑے ہی راست انداز میں وہ ہمیں آگاہ کر جاتے ہیں کہ ان کے یہاں رنگ تغزل میں قدیم وجدید کی آمیزش کے

توسط سے نئے پن کے احساس کو نمایاں مقام حاصل ہے ۔

میرے اشعار میں جدت بھی روایات بھی ہیں
دل کی باتوں کو بہ اندازِ غزل کہتا ہوں

جیسا کہ ہر شاعر اپنے شعری سفر کا آغاز تقریباً عشقیہ اشعار کے ساتھ کرتا ہے، حضرتِ ناشادؔ بھی اس روایت سے مستثنیٰ نہیں رہے ہیں۔ عشق و محبت کی باتوں کا ان کے ایک شعر میں یوں اظہار نظر آتا ہے ۔

ہیں تری نذر دل و جان کہ جانم تو نے
آنکھوں آنکھوں سے سہی پیار کا اعلان کیا

شاعر جب سماج و اطراف کے حالات کا رُخ کرتا ہے تو اس وابستگی کے نتیجے میں تجربات و مشاہدات پیش کرنے کے عمل کو بہرصورت اپنے فرائض منصبی میں شمار کرتا ہے ۔

ہم اہل فن ہیں کہیں گے جو دل پہ بنتی ہے
چڑھیں گے دار پہ ہم پھر بھی مسکرائیں گے

اور عصر حاضر میں حالات ایسے ہیں کہ شاعر مضطرب ہے اور مسموم فضاؤں میں سانس لینا بھی اسے گویا محال ہے۔ ایک شعر میں عکاسی دیکھئے ۔

دھواں دھواں سا ہے اب شہر کی فضاؤں میں
میں کیسے سانس لوں اس طرح کی ہواؤں میں

متذکرہ کتاب کے مضمون نگاروں میں ہر مرتبے کے لوگوں کا اشتراک ہے، مثلاً ایک جانب اگر پروفیسر وہاب اشرفی، ناوکؔ حمزہ پوری، پروفیسر علیم اللہ حالیؔ، پروفیسر محفوظ الحسن اور ڈاکٹر اعجاز علی ارشد وغیرہ کی جلوہ گری ہے تو دوسری جانب نثار احمد صدیقی، بےؔ نام گیلانی، سہیل انجم اور ڈاکٹر بختیار نواز جیسے مزید کئی لوگوں کی شمولیت متوازن معلوم ہوتی ہے۔

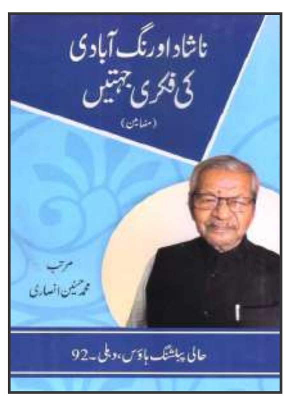

''گوشہ ناشادؔ اورنگ آبادی: مشاہیر کی آرا'' سے موسوم باب میں ناشادؔ اورنگ آبادی کے تعلق سے تحریر کردہ توصیفی کلمات ہیں جہاں شاعر و ناقد کی یکساں شرکت ہے۔ اس ذیل میں مختصراً چند مشہور و معروف شخصیات میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر عنوان چشتی، پروفیسر عبدالمغنی، کلیمؔ سہسرامی، مظہر امامؔ، ڈاکٹر قمر رئیس، اویس احمد دوراںؔ اور غلام ربانی تاباںؔ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ بطور مجموعی جن کے فرمودات کے وسیلے سے ناشادؔ اورنگ آبادی کا تعارف، ہندی اردو کے ان کے شعری مجموعوں کے افکار، نمونے کے اشعار کے اندراجات کے علاوہ شعری اختصاصات وغیرہ کے ساتھ بہار اور بیرون بہار میں منعقد ہونے والے کئی آل انڈیا مشاعروں میں ان کی شرکت کے احوال ہماری فہم کا حصہ بن جاتے ہیں۔

کتاب میں ''تعارف'' کے پانچ صفحات بہ یک نظر ناشادؔ اورنگ آبادی تک رسائی حاصل کرنے میں بڑے کارآمد ہیں اور وہ اس سبب سے کہ یہاں نامِ اصل کے ہمراہ تخلص سے چل کر تاریخ پیدائش و جائے پیدائش کے علاوہ ان کی ملازمت کی اطلاع سے گزرتے ہوئے آغازِ شاعری اور اس سے وابستہ حصولیابیوں کے مفصل ریکارڈ دستیاب ہیں۔ مثلاً اعزازات سمیت کلام کی اشاعت وغیرہ۔

''میں اور میری شاعری'' شاعر کا تحریر کردہ ایک ایسا صفحہ ہے جہاں امجھر شریف کے شاعرانہ ماحول سے اپنی شعر گوئی کی نسبت بحال کرتے ہوئے آغازِ شاعری کی کیفیات، مشہور محققین و ناقدین کو ادبی ہدایات، کلام کی اشاعت کے لئے اردو ہندی اخبارات و رسائل کے مدیران کے ساتھ ہندوستان کے مختلف شہروں میں اپنے اعزاز میں کی گئی نشستوں کے اہتمام کاروں کے تئیں تشکر کے کلمات اور اپنی جائے پیدائش شمشیر نگر (اورنگ آباد) کی یادوں کے حوالے سے جہانِ شعری کے سفر میں رابطے میں رہے بڑی تعداد میں شاعر و ادیب کے اسمائے گرامی کے برملا اظہار کا نمایاں نظم ہے۔

بہار اردو ڈائرکٹوریٹ کا مجلّہ ''اکابرین ادب بہار: ایک مطالعہ'' انوار الحسن وسطوی کی اصلاً تقریب اجرا کی پیش کردہ رپورٹ ہے جسے شاید محض اس واسطے سے کتاب میں شمولیت دی گئی ہے کہ وہاں کئی شاعروں اور ادیبوں کے درمیان ناشادؔ اورنگ آبادی کا ذکر خیر بھی ہے۔ متذکرہ کتاب ناشادؔ اورنگ آبادی کی رسالہ ''زبان وادب'' پٹنہ کے توسط سے عام ہوئی انتقال کی خبر کے ساتھ شعرا کے منظوم خراجِ عقیدت پر

اپنے اختتام تک پہنچتی ہے۔اس طرح یہ کہ میری نظر میں یہ کتاب بنام ''ناشادؔ اورنگ آبادی کی فکری جہتیں'' محمد حسنین انصاری کی کاوشوں کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو ناشادؔ اورنگ آبادی کے سلسلے میں دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ عین معلوماتی بھی ہے۔

نام کتاب	:	سبدگل	
مصنف	:	محمد حفیظ الدین ماجدؔ نظامی سملوی	
مرتب وناشر	:	محمد نسیم الدین	
اشاعت	:	۲۰۲۲ء	
صفحات	:	۲۲۴	قیمت : ۳۵۰روپے
مبصر	:	ڈاکٹر منوّر راھی	

''سبدگل'' محمد حفیظ الدین ماجدؔ نظامی سملوی کا شعری مجموعہ ہے۔ ماجدؔ نظامی کا تعلق ''بہٹا'' پٹنہ سے ہے جو کہ ادبی لحاظ سے کافی معروف ہے۔مبارکباد کے مستحق ہیں محمد نسیم الدین صاحب،جنہوں نے اپنے والد کے ادبی سرمایہ کو نہ صرف سنبھال کے رکھا، بلکہ اسے شعری مجموعہ کی شکل میں مرتب اور شائع کرا کے سعادت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے شائقین ادب کے ذوق کا سامان فراہم کیا۔ ماجدؔ نظامی کے شعری شعور کے متعلق کہنہ مشق استاد شاعر جناب ناوکؔ حمزہ پوری کے رشحات قلم سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اسلوب اور انداز میں پختگی کا رنگ نمایاں ہے۔ ماجدؔ نظامی کی شاعری حقیقت کی آئینہ دار ہے۔انہوں نے جب وادیٔ غزل میں قدم رکھا تو حسن وعشق کے موضوعات نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔نتیجتاً ان کی غزلوں کو عشقیہ جذبات نے حسن بخشا۔ ماجدؔ نظامی نے حق کی صدا کو بڑی مضبوطی سے اپنی شاعری میں بلند کیا ہے۔مناسب اور برمحل الفاظ کو نبھانے کا ہنر بھی انہیں خوب آتا ہے۔

''سبدگل'' میں لگ بھگ ۲۵ نظمیں، ۱۴۶ غزلیں اور ۵ سہروں کے ساتھ چند قطعات بھی ہیں۔مختصر طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ماجدؔ نظامی نے شاعری کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے اور جس صنف پر بھی قلم اٹھایا ہے اس میں ہنرمندی دکھائی ہے۔ ان کی نظموں میں ان کا مذہبی رجحان اور قوم سے ہمدردی ومحبت کا جذبہ موجزن ہے۔اس مجموعہ میں شامل پہلی نظم ''فرزندانِ اسلام سے خطاب'' میں وہ قوم وملت کو کھوئی ہوئی عظمت اور وقار کا احساس دلاتے ہوئے اسے دوبارہ حاصل کرنے کی سعی وکوشش پر آمادہ کرتے ہیں۔ یہ نظم مسدس کے فارم میں لکھی ہوئی ہے۔اس کا بیشتر بند اہل ایمان کو اپنا محاسبہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔اس کے علاوہ ماجدؔ نظامی نے ''سہرے'' پر بھی طبع آزمائی کرتے ہوئے سہرے کی ادبی اہمیت ثابت کی ہے۔ جہاں ''سہرے'' میں خوشی ومسرت کا اظہار ملتا ہے، وہیں نوعروس جوڑے کو ناصحانہ انداز میں بڑی قیمتی نصیحت بھی ہے۔مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیں کہ ؎

یہیں سے زندگانی کا نیا آغاز ہوتا ہے
حیاتِ نو ہے جیتی جاگتی تعبیر سہرے کی

''غزل'' بیشتر شعرا کی محبوب صنف سخن رہی ہے۔ ماجدؔ نظامی نے بھی غزل میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی غزلوں میں جہاں جذبہ عشق لطیف رنگ و پیراہن اختیار کرتا ہے، وہیں مناظر قدرت کے دلکش نظارے بھی اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہیں۔صفحہ ۶۷ پر شائع غزل کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

ابھی عشق کا راز کیسے بتاؤں
زمیں پر نہ آجائیں یہ چاند تارے
میں حسرت بھری آنکھ سے دیکھ لوں گا
کسی کے پر انوار دلکش نظارے

اس سے قبل صفحہ ۶۶ کی غزل کا ایک شعر بھی متوجہ کرلیتا ہے، جس میں انہوں نے خوشی اور غم دونوں کو زندگی کا حصہ قرار دیا ہے، گویا ماجدؔ کبھی غم کا رونا نہیں روتے بلکہ غم کو زندگی کا حصہ قرار دیتے ہیں ؎

وفا اور جفا کا ہوں خوگر کچھ ایسا
خوشی اور غم ایک جا چاہتا ہوں

عام طور سے غزل کے اشعار مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ماجدؔ صاحب کی ایک غزل جو صفحہ ۱۴۶ پر ہے،اس کا ایک شعر ''عشق حقیقی'' کا احساس دلاتا ہے کہ ؎

رحمت کا ترے جوش میں آ ہی گیا دریا
تنگ آ کے زمانے نے ہے جب تم کو پکارا

اس شعر میں ماؔجد صاحب انسانوں کو ناامیدی اور مایوسی کے عالم سے نکال کر اللہ کی رحمت کا یقین دلاتے ہیں کہ جب تمام راستے بند ہوں تو واحد اللہ کا سہارا ہے۔ اللہ اپنے بندوں کو درگزر کرتا ہے اور رحمتوں کا دریا بہا دیتا ہے۔ صفحہ ۱۴۷ پر شائع غزل کے درج ذیل شعر میں وہ عشق کی کیفیت بیان کرتے ہوئے بے بسی کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ ؎

جذبہ عشق کی ہائے وحشت نہ پوچھ
لب پہ نام ان کا بے اختیار آ گیا

ماؔجد صاحب کی غزلوں کے بیشتر اشعار تغزل کے رنگ و پیراہن میں نہایت دلکش نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محبوب کی فرقت، وصل کی تمنا اور اضطرابی کیفیات عیاں ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ عام طور سے ایسے مضامین کسی شاعر کے ابتدائی دور کی شاعری کا احساس دلاتے ہیں۔ کچھ مانوس الفاظ بھی ماؔجد نظامی کے اشعار میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ ''سبدگل'' کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ موصوف نے چند غزلوں میں حفیظؔ تخلص کیا ہے اور پھر وہ ماؔجد تخلص کرنے لگے۔

ماؔجد نظامی نے ''طرحی'' غزلیں بھی کہی ہیں، جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے لئے طرحی غزل کہنا بہت آسان نہیں تو بہت دشوار بھی نہیں ہے۔ نمونے کے طور پر تضمین کا یہ شعر (ص۷۰) دیکھیں ؎

جو اشک ضبط سے تھم جائے وہ لہو کب ہے
''مجھے تھمے ہوئے اشکوں کا اعتبار نہیں''

غزل میں جہاں محبوب کے لب ورخسار، عارض وگیسو اور بے وفائی جیسے الفاظ کی کثرت ہوتی ہے، وہیں غم عشق اور وصال وہجر کے تذکرے بھی غزل کو حسن بخشتے ہیں۔ فراقِ محبوب کی لذت کو ماؔجد نظامی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ صفحہ ۸۲ پر یوں تضمین کیا ہے کہ ؎

شب فرقت گزر ہی جائے گی ہنس ہنس کے رو رو کے
''جہاں وہ ہیں وہیں اے چاند لے جا چاندنی اپنی''

ماؔجد نظامی کی غزل ''بتاؤ اب چمن کے جانے پہچانے کہاں جائیں'' (ص۱۵۵) پڑھ کر فلم ''دوبدن'' کا مشہور شعر یاد آتا ہے ؎

بھری دنیا میں آخر دل کو سمجھانے کہاں جائیں
محبت ہوگئی جن کو وہ دیوانے کہاں جائیں

صفحہ ۱۳۵ پر پروف ریڈنگ کے وقت نظر ثانی کی کمی کا احساس ہوتا ہے کہ غزل کی ''طرح'' کچھ اور ہے، لیکن اُس پر صفحہ ۱۳۴ کا عنوان آ گیا ہے۔

بہر کیف ماؔجد صاحب نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ طرحی غزلوں میں قافیہ ردیف کو نبھایا ہے۔ اس سے ان کی موزونی طبیعت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ شعر گوئی پر کس قدر قدرت رکھتے تھے۔ ان کی زیادہ تر غزلیں سالم اور مترنم بحر میں ہیں۔ محمد نسیم الدین صاحب نے ''پیش لفظ'' کو ''احوال واقعی'' اور استاذ الشعرا جناب ناوؔک حمزہ پوری کے مضمون ''رونمائی'' کے علاوہ تین باب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب (ص۲۴ تا ص۶۴) نظموں کا ہے جس میں نظمیں اور سہرے شامل ہیں۔ دوسرا باب غزلوں کا ہے جو صفحہ ۶۶ سے صفحہ ۲۰۸ تک ہے جس میں ۱۴۶ غزلیں شامل ہیں۔ تیسرا اور آخری باب صفحہ ۲۱۰ سے صفحہ ۲۲۴ تک ہے جس میں قطعات ہیں۔ پہلا قطعہ بارگاہِ رسالت میں عقیدت ومحبت کا نذرانہ ہے۔ دیگر قطعات بھی عمدہ اور اہم ہیں۔ ایک قطعہ پیش خدمت

ہے جس میں محبوب کا حسن شاعر کو بے قرار و بے چین کرتا ہوا نظر آتا ہے ؎

حسن کی چشم فسوں ساز نہ جینے دے گی
آپ کی موہنی آواز نہ جینے دے گی
عشق میرا مجھے مرنے نہیں دے گا ماؔجد
پر وہ کافر نگہ ناز نہ جینے دے گی

مجموعی طور پر ماؔجد نظامی کی شاعری دل کو متوجہ کرتی ہے۔ عمدہ اور پاکیزہ افکار کو وہ شعری پیکر عطا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ محمد نسیم الدین صاحب کی اس کاوش کو اہل علم ودانش قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور کتاب ''سبدگل'' دنیائے شعر وادب میں اپنی خوشبو اور تازگی بکھیرتی رہے گی۔ محمد نسیم الدین صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ''سبدگل'' کا ''انتساب''، ''اردو زبان وادب کے نگہبانوں کے نام'' کر کے اردو سے قلبی لگاؤ کا ثبوت دیا ہے۔

نام کتاب	:	خوشبو کی آواز		
مصنفہ وناشرہ	:	خوشبو پروین		
صفحات	:	۱۱۲	قیمت :	۱۰۰روپے
مبصرہ	:	رابعہ خاتون		

رباعی ایک قدیم اور عظیم صنف شاعری ہے اور اس سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے کہ ہیئت پر مبنی اس عجم نژاد صنف نے اردو میں بھی خوب برگ وبار لایا ہے اور ہندو پاک کے دیگر خطوں اور علاقوں کی طرح سرزمین بہار کے حوالے سے بھی اس کی شاندار اور سدابہار روایت ملتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس صنف کی طرف خواتین کی توجہ ہمیشہ ہی برائے نام رہی اور اس میں کچھ تعجب بھی نہیں، اس لئے کہ جس صنف کی مشکلوں سے مسلسل انتباہ نے مردوں کو انتہائی محتاط، بلکہ نفسیاتی طور پر یک گونہ خائف بنا رکھا ہو، اس کی طرف عورتوں کا ملتفت ہونا چنداں آسان نہ تھا، مگر وقت کے ساتھ ساتھ رجحانات بہرحال بدلتے ہیں اور مواقع میں وسعت آ ہی جاتی ہے۔

دیگر تفصیلوں سے قطع نظر جہاں تک بہار کا تعلق ہے، میری محدود معلومات اور میرے ناقص مطالعہ کی حد تک یہاں رباعی گو شاعرہ کی باقاعدہ آمد کے لئے زمانہ مدتوں چشم براہ رہا۔ یہاں ''باقاعدہ آمد'' سے میری مراد دیوانِ رباعیات یا مجموعہ رباعیات کے ساتھ آمد ہے اور اس پہلو کے پیش نظر کتاب ''خوشبو کی آواز'' ایک تاریخی اہمیت کا احساس دلاتی ہے۔ یہ کتاب محترمہ خوشبو پروین کی ایک سو ایک رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ موصوفہ کا تعلق مونگیر سے ہے اوان کی ہمت و کاوش کو سلام کہ انہوں نے اپنی جامعاتی تعلیم کے دور میں ہی یا یوں کہیں کہ عنفوان شباب میں ہی اپنی رباعیوں کا بیڑا حضرت ناوک حمزہ پوری کی دعاؤں کے ساتھ، کامیابی سے پار لگایا ہے۔

زیر نظر کتاب کا انتساب شاعرہ نے اپنی ''والدہ محترمہ کے نام'' کیا ہے اور پھر حضرت ناوک حمزہ پوری کی تحریر کے بعد ''حرف چند'' کے عنوان سے شاعری اور خصوصاً رباعی گوئی کی طرف آنے کی داستان نہایت خوبی، خوبصورتی اور خلوص کے ساتھ قلم بند کردیا ہے جس سے ان کے جذبے کی صداقت اور حصول مطلوب کے لئے بے پناہ محنت کا احساس، ایک بار پھر انہیں ''مبارک باشد و باشد مبارک'' کہنے پر مجبور کررہا ہے۔ انہوں نے جہاں اوزانِ رباعی کے تعلق سے چند ذہن ساز سطریں لکھی ہیں، وہیں بہت صاف گوئی سے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ یہاں چوبیس اوزان میں سے بہت کم اوزان کا استعمال کرسکی ہیں، لیکن اس کے باوجود اکثر رباعی گو شعرا کی روایت بہرحال اُن کے ساتھ ہے۔ چند اوزان کا استعمال کچھ خاص نہیں بلکہ خاص بات تو ہے کہ انہوں نے پہلی بار اپنی رباعیوں کا یہ مجموعہ اپنی زندگی کے بہترین پن میں، طویل مشق و ممارست اور ریاضت کی سند کا شوق رکھے بغیر سامنے لایا ہے جس کی نوعیت یک گونہ مثالی بھی ہے اور جیسا کہ کہا گیا تاریخی بھی ہے۔

زیر نظر مجموعہ یقیناً رباعی گوئی کے حوالے سے ایک ایسی پرشباب اور حساس و باشعور شاعرہ کی تصویر ہمارے سامنے پیش کردیتا ہے جو نہ صرف محبت کی بھوکی، (ص۵۱ وص۵۳) محبت کے واشگاف اقرار و اظہار کی طالب اور پرسان حال کی تمنائی (ص۸۱) ہے بلکہ وہ بالکل فطری انداز سے استعارے کی زبان میں اظہار تشنگی کے لئے شاعری کو وسیلہ بناتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ کوئی پیار کرنے والا، سوئے ہوئے جذبات کو جگانے والا اور گلے لگانے والا ہو۔

سوئے ہوئے جذبات کو دھیرے سے جگا
آنکھوں سے مرے خواب کو آہستہ چرا
ادنیٰ سی یہ خواہش ہے دل خوشبو کی
اک بار مجھے پیار سے سینے سے لگا

شاعرہ مغلوب محبت (ص۷۱) ضرور ہے، مگر اہم ترین بات یہ ہے کہ اس نے اس حوالے سے کہیں بھی انسانی اور اخلاقی تقدس کی پامالی کا شائبہ بھی اپنی رباعیوں میں نہیں آنے دیا ہے، بلکہ ہمیشہ آس وامید کے دیئے جلائے رکھا ہے، وہ اگرچہ یادشبانہ کی یورشوں میں گھری ہے اور یک گونہ کرب واضطراب سے گزر رہی ہے (ص۶۲ وص۶۷) لیکن اس کے باوجود وہ مقدر پر شاکر ہے (ص۷۰) اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اس کے یہاں تمنائے محبت (ص۳۷) یادِ محبوب، رات کی تنہائی کے احساس، اضطراب دل (ص۱۰۳) انتظار (ص۳۸) محبوب کی آمد پر

اپنے احساس دروں کا اظہار (ص۴۰) تنہائی کے صدمات، نوع بنوع شدت اضطراب (ص۵۶،ص۶۳،ص۶۶،ص۸۵) محبوب کے تصور (ص۴۲) اس کے وعدے پر یقین واعتماد (ص۴۳) اور مکمل پیار (ص۸۶) جیسے رنگارنگ موضوعات ومضامین پر مبنی رباعیاں ملتی ہیں، لیکن یہ بات بہت ہی خاص ہے کہ ان میں نسوانی ومشرقی حیا پر عصری ومغربی ادا کہیں بھی غلبہ پاتے ہوئے دکھائی نہیں دیتی۔

فکروفن اور موضوعاتی تنوع کی جہت سے دیکھا جائے تو خوشبو پروین کے یہاں نہ صرف غیر مردف رباعی (ص۵۸) اور ایک سے زیادہ اوزان میں کہی گئی رباعی ملتی ہے، بلکہ اس کے یہاں پیامی رباعی (ص۶۴) بھی موجود ہے۔ مجموعہ کے آغاز میں جو تقدیسی رباعیاں آئی ہیں وہ حمد ومناجات، دعاوالتجا اور نعتیہ مضامین پر مشتمل ہیں اور ان میں ہلکا سا صوفیانہ رنگ اور نسائی لہجہ بھی ملتا ہے۔ شاعرہ روضۂ رسول دیکھنے کی تمنائی ہے (ص۱۷) اور جہاں اس نے اپنی رباعیوں میں دنیا کی بے ثباتی (ص۲۰) کا مضمون باندھا ہے، وہیں ہماری آج کی دنیا کے حال و احوال دکھایا ہے (ص۳۵) وہیں دنیا کی رنگینی سے انتباہ کا مضمون (ص۴۸وص۶۱) بھی لایا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ خوشبو پروین کے یہاں کہیں کہیں علا پر طنز (ص۱۹) بھی ہے اور کہیں زنانہ طنطنہ کے ساتھ جھنجھلاہٹ کا اظہار (ص۲۵) ذاتی خودستائی (ص۳۳) سوانحی تہذیب وماحول کا اشارہ (ص۹۹) اور اپنے کلام سے تقابل (ص۱۰۰) بھی ملتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ شاعرہ نے جس انداز سے اخلاق ونصیحت کے مضامین باندھا ہے (ص۱۶،ص۲۹، ص۵۸) اور کم گوئی کے فائدے دکھایا ہے، وہ لائق التفات ہے ؎

کم گوئی سے کردار سنور جائے گا
بکواس سے جینے کا ہنر جائے گا
اس امر کو اس طرز پہ سمجھیں حضرت
کھولے گی صدف منھ تو گہر جائے گا

اسی طرح شاعرہ نے محبت کا ماحول بنانے اور عصری تناظر میں زندگی کو سنوارنے کا جو پیغام دیا ہے (ص۲۸،ص۶۴،ص۴۵) اور رجائیت کی جو باتیں کی ہیں (ص۲۱وص۳۹) وہ بھی بہرصورت اثر وتاثیر سے محروم نہیں۔

ممکن نہیں پورا تو ذرا سا رکھئے
مشکل میں دعاؤں کا سہارا رکھئے
مرنا تو مقدر ہے مگر اے خوشبو
ہر حال میں جینے کی تمنا رکھئے

خوشبو پروین نے جہاں صنف رباعی سے محبت (ص۲۴وص۵۳) ماں سے بیٹی کے جذباتی رشتے (ص۳۰) اور اردو کے موضوع (ص۹۷) پر رباعیاں کہی ہیں، وہیں ان کی رباعیوں میں اندیشہ مستقبل (ص۷۶) آزادی میں گھٹن کی کیفیت (ص۴۷) اور احساسات زندگی کی گہری عکاسی بھی ملتی ہے اور عصری حسیت کے حوالے سے ہمہ جہت ملی زوال کا نقشہ بھی دیکھا جا سکتا ہے ؎

نہ دین رہا نہ دولت ہی رہی
نہ فقر نہ فاقہ ، نہ قناعت ہی رہی
سب چھین لیا غیر نے دھیرے دھیرے
نہ علم رہا پاس نہ حکمت ہی رہی

مومن ہوں پہ کافر کی طرح زندہ ہوں
زندہ ہوں مجاور کی طرح زندہ ہوں
معلوم نہیں حشر ہمارا ہم کو
گمنام مسافر کی طرح زندہ ہوں

خوشبو پروین کے یہاں موضوعات کے دھنک رنگ ہی نہیں بلکہ فکر و پیام اور گہری حساسیت کی نازک جہتیں بھی روشن ہیں اور اپنی ذات سے بیزاری کی نفسیات، اس کے اسباب (ص۶۸) اور پھر نسوانی مسائل و ماحول کے ذہنی اثرات کا اظہار (ص۶۹) بھی ان کے یہاں دیدنی ہے ؎

دل پر میں کوئی بوجھ اٹھاؤں کب تک
اب راز زمانے سے چھپاؤں کب تک
اب ختم ہوئی جاتی ہے میری ہمت
بکھرے ہوئے رشتوں کو نبھاؤں کب تک

شیشے یہ وفاؤں کے اگر ٹوٹ گئے
مانو کہ مقدر ہی ترے پھوٹ گئے

پھر کیسے ملے گی تجھے راحت خوشبو
ماں باپ ہی جب تجھ سے کبھی چھوٹ گئے

آپس میں رہیں بن کے یہاں ہم سب پھول
بے وقت لڑائی کو نہ دیں ہرگز طول
ہر حال میں رشتوں کا بھرم رکھ خوشبو
غیروں کی محبت میں تو اپنوں کو نہ بھول

اتنا ہی نہیں بلکہ خوشبو پروین نے اپنی رباعیوں میں محبوب کا شکوہ بھی کیا ہے (ص۵۶،ص۸۱ وص۱۰۳)، طرح طرح سے درد وکرب کے تذکرے لایا ہے (ص۴۷،ص۵۶،ص۵۰) اور اظہار تاسف کے ساتھ عورت کا کرب دکھایا ہے (ص۶۵) لیکن اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے گھبراہٹ اور یک گونہ احساس اسیری کے باجود ذاتی انا (ص۳۴) کا سودا نہیں کیا ہے بلکہ ہمت جٹاتے کا رہنے کا نقشہ سامنے لا دیا ہے۔

افسوس کہ خود سے بڑی بیزار ہوں میں
اس دہر میں بے یار و مددگار ہوں میں
پل بھر بھی یہاں مجھ کو میسر نہ سکوں
مولیٰ مرے شاید کہ گناہگار ہوں میں

یہ ہے شاعرہ کا احتساب نفس اور یہی وہ عنصر ہے جو اُسے ایک حوصلہ مند خاتون کے روپ میں ہمارے سامنے لے آتا ہے، ایسی خاتون جو تنقید سے سنورنے اور تنقیص سے خوشبو بن کر پھیلنے کا عزم وحوصلہ رکھتی ہے۔

تنقید سے کچھ اور سنور جاؤں گی
اس صنف کی تہہ تک میں اُتر جاؤں گی
تنقیص ہوئی میری تو انشاء اللہ
خوشبو ہوں گلستاں میں بکھر جاؤں گی

درج بالا رباعی پیش نظر مجموعہ کی آخری رباعی ہے یہاں اگرچہ بات ایک صنف کے حوالے سے آئی ہے جو یقیناً صنف رباعی ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ شاعرہ نے اپنی رباعی کو اپنی غزل سے بہتر کہا ہے اور اس صنف کی خدمت کا برملا اظہار کیا ہے (ص۱۰۰ وص۱۰۲) لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بالواسطہ انداز سے یہاں شاعرہ کا ذاتی مزاج و ماحول، انداز فکر اور فنی نظریہ بھی سامنے آجاتا ہے جو صالح تنقید سخن کی افادیت اور غیر صالح تنقید سخن یا یوں کہیں کہ محض تنقیص فن کی بے اثری پہ اس کا اعتماد ہمارے سامنے لا دیتا ہے۔

بیشک خوشبو پروین کے یہاں لطیف احساس کی منظر کشی (ص۶۰) طرح طرح کی تمناؤں کا اظہار (ص۵۷) زنانہ کیف و وارفتگی، گہری جذباتیت (ص۵۷) عورت کا ملتجیانہ انداز (ص۲۷) جذبہ تشکر کا اظہار (ص۶۶) ہی نہیں، رومان کا موضوع (۹۲) بھی بہت سلیقہ سے رباعی کی زینت بنا ہے۔ آیئے آگے پڑھنے سے پہلے مزید چند رباعیوں سے ضیافت کا فریضہ بھی ادا ہوجائے۔

دہکے ہوئے شعلوں کو بجھاؤں کب تک
بھڑکتے ہوئے جذبات دباؤں کب تک
افسوس کہ اب چھوڑ دیا اس نے مجھے
یک طرفہ یہ رشتہ میں نبھاؤں کب تک

ارماں مرے دل کے نکالو تو سہی
سوئے ہوئے جذبات جگاؤ تو سہی
پیاسا ہے بہت پیار کا خوشبو کا نین
اب آکے مری پیاس بجھاؤ تو سہی

خوشبو پروین کی رباعیوں میں طنزیہ انداز، سوالیہ لہجہ (ص۷۰) اور واقعی ''ہر چال سلیقہ سے چلی ہے خوشبو'' (ص۹۹) کے مصداق اُن کے یہاں تصنع سے مبرا زنانہ زبان ہی نہیں بلکہ تانیثی لہجہ (ص۹۳،ص۱۴) خطابیہ و سوالیہ انداز (ص۷۱وص۴۹) زنانہ طنطنہ لئے ہوئے لفظ ولہجہ (ص۲۵و ص۳۸،ص۴۰ وص۴۲ نیز ص۴۱، ص۴۴، ص۶۶ وص۸۰) خود سے خطاب (ص۲۶ وص۵۸) اور لہجہ کی معصومیت (ص۵۷) بھی قاری کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے۔

سندر سا کوئی خواب سجانا ہوگا
زلفوں پہ مقالات سنانا ہوگا
مجبور میں کردوں گی تجھے اے ہمدم
آنکھوں سے مری آنکھ ملانا ہوگا

خوشبو پروین کے اس مجموعہ رباعیات میں ردیف کے لحاظ سے دیکھیں تو صرف پندرہ حروف تہجی آسکے ہیں۔ ح، ط، گ، م کے تحت ایک ایک، ز کے تحت دو، د اور ل کے تحت تین تین، ب اور ت کے تحت بالترتیب چار، پانچ، ک کے تحت چھ، ی اور ن کے تحت دس، الف کے تحت گیارہ، واو کے تحت چودہ اور ے کے تحت انتیس رباعیوں نے جگہ پایا ہے اور جہاں تک ردیفی الفاظ کی بات ہے ب، ت اور ک میں محض ایک یا دو لفظ ہی تک معاملہ محدود ہے اور ن، واو اور ے میں ردیفی الفاظ ردیف کی تعداد کے نصف سے قریب ہی رہ گئے ہیں جس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ شاعرہ نے بہت ہی کم لفظوں کو ردیف میں بار پانے کا موقع دیا ہے اور کئی حروف تہجی بھی گویا حسن اتفاق سے ہی جگہ پاسکے ہیں۔ ممکن ہے ایک نہیں کئی رُخ سے یہ اعداد وشمار بظاہر اہم محسوس نہ ہوں، مگر اس لحاظ سے افادہ بخش ضرور ہوسکتے ہیں کہ ان سے رباعی کے مجموعہ کو آئندہ رباعی کے دیوان تک لے جانے میں مدد ملنے کا امکان ہے اور اصلاً اسی جہت سے یہاں یہ باتیں لکھی بھی جارہی ہیں۔

زیرنظر مجموعہ میں نہ صرف ''ہوش پرستی'' (ص۲۳) ''سسبھلو'' (ص۲۶) اور ''افسوس کے'' (ص۴۷) جیسی کمپوزنگ کی غلطیاں رہ گئی ہیں، بلکہ کچھ اور ایسے پہلو بھی ہیں جو بیک نظر کھٹک جاتے ہیں مثلاً کہیں حشو وزوائد کا احساس ہوتا ہے تو کہیں نثر اور محاورے کی کمزوری (ص۳۰وص۶۰) سے واسطہ آن پڑتا ہے اور ''ہر ایک زبان پر ہے زبان اردو'' (ص۹۷) جیسا مصرع عدم بلاغت اور غلو کی آغوش میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ صفحہ ۱۰۶ کی شخصی رباعی میں ایک دعائیہ مصرع آیا ہے ''اللہ مرے ان کو سلامت رکھنا'' اور کہا جاسکتا ہے کہ اس میں علامت

قرأت کا استعمال اور لفظی دروبست کا خیال ضروری تھا اس لئے کہ قلم دست حنائی میں ہے اور نسوانی محاورے کی رو سے یہاں ایک ایسا پہلو بھی آرہا ہے جسے شاعرہ خود ہی بہ آسانی سمجھ سکتی ہیں۔ یہاں

صفحہ ۳۴ پر ''بیٹی ہے مہمان نہیں ہے خوشبو'' اور صفحہ ۵۵ پر ''معشوق تو راضی بہ رضا ہوتا ہے'' جیسے مصرعے بھی مضمون کے لحاظ سے غور طلب ہیں، اس لئے کہ بیٹی تو مہمان ہی ہوتی ہے اور راضی بہ رضا ہونا عاشق صادق کا وصف ہے۔ اتنا ہی نہیں ضمنی طور سے کچھ اور باتیں بھی توجہ طلب محسوس ہوتی ہیں، مثال کے طور پر صفحہ ۴۴ اور صفحہ ۴۵ کی رباعی کا دوسرا مصرع صرف اپنے آخری ٹکڑے ''ملاؤ تو سہی'' اور ''ملایا جائے'' سے ہی الگ الگ ہو پایا ہے۔ ''خدا خیر کرے'' کی ردیف صفحہ ۳۲ کے بعد صفحہ ۴۶ کی رباعی میں بھی آگئی ہے، پھر یہ بھی کہ شاعرہ نے اکثر طویل طویل ردیف مثلاً ''کی آہٹ دیکھو'' (ص۴۸) سے کام چلایا ہے اور نہ صرف یہ کہ رباعی میں تخلص لایا ہے بلکہ اپنے تخلص یا پورے نام کو رباعی کی ردیف بھی بنایا ہے۔

مذکورہ باتیں اپنی جگہ، لیکن اسی کے ساتھ ''خوشبو کی آواز'' بتاتی ہے کہ شاعرہ نے جو رباعیاں لکھی ہیں ان میں آخری مصرع کے زوردار ہونے کا وصف بہرصورت ملتا ہے۔ بھلا ''ہر سمت ہے طوفان کی آہٹ دیکھو'' (ص۴۸) جیسے مصرع کی سادگی و شستگی اور روانی وسلاست سے کون انکار کرسکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کی رباعیوں میں کہیں کہیں نثری انداز اور سپاٹ پن بھی آگیا ہے، لیکن، زور بیان کا وصف بہرحال قائم رہا ہے، مجموعہ کی پہلی حمدیہ رباعی دیکھیں۔

معبود خدا ہے مرا خوشبو پروین
مسجود خدا ہے مرا خوشبو پروین
میں اور کسی شے کی طلبگار نہیں
مقصود خدا ہے مرا خوشبو پروین

یہ رباعی اگرچہ ردیف میں نام و تخلص کے ساتھ آئی ہے اور ردیف بھی خاصی طویل ہے، لیکن اس میں مضمون ومطلوب کی پاکیزگی اور نسوانی زبان کے استعمال کی برجستگی یقیناً معترف بناتی ہے۔ اگر ایک طرف ''مجبور مہاجر کی طرح ہیں ہم لوگ'' (ص۲۰) ''رزاق کا وعدہ ہے وہ روزی دے گا'' (ص۹۶) ''درد دل ہمراز کہاں سے لاؤں'' (ص۱۰۸) جیسے مصرعے تحت نقاط اور فوق نقاط کی مثالیں بن کر آتے ہیں اور ''افراط سے تفریط سے سب زیر وزبر'' (ص۹۸) جیسا مصرع تضاد کی عمدہ مثال بنتا ہے تو دوسری طرف ''ہر حال میں جینے کی تمنا رکھئے'' (ص۳۸) اور

''تہذیب وتمدن کو بچا کر رکھئے/گہوارۂ گلشن کوسجا کر رکھئے'' (ص ۲۸) جیسے مصرعے پیامی مقولہ کی شان وشوکت کا احساس بھی تازہ کر دیتے ہیں۔ یہاں ساری باتیں مثالوں کے ساتھ لکھنا ممکن نہیں، پھر بھی اتنا ذکر تو ہونا ہی چاہئے کہ زیرنظر مجموعے کی رباعیوں میں ''بھلا دوں/بھلا یا دوں'' (ص ۳۹) ''دریا میں دیا'' (ص ۴۱) ''جلوت میں خلوت'' (ص ۴۹) ''کوکوئی'' (ص ۳۷) اور ''بھی، ابھی'' (ص ۹۴) سے تجنیس کے نوع بنوع پہلو مسرت کا سامان لاتے ہیں۔ تراکیب کے لحاظ سے یہاں ''دریائے رباعی'' (ص ۱۰۲) بھی ہے اور ''شعلوں کی جوانی'' بھی۔ (ص ۳۳) متعدد رباعیوں میں تشبیہ (ص ۲۰، ص ۳۳ وص ۹۸) تعلیق و مناسبات (ص ۲۳، ص ۵۰، ص ۵۷ وص ۱۰۲) ہندی الفاظ (۳۵) صنعت ترجمہ (ص ۱۸) اور حسن محاورت (ص ۴۴ وص ۵۹) کی مثالیں بھی ملتی ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان کا آورد سے کوئی لاگ لپٹ نہیں ہے۔ اسی طرح تمثیل کا انداز (ص ۹۵) مبالغت (ص ۵۲) سہل ممتنع (ص ۹۶) اشتقاق وحسن تکرار (ص ۶۷) استعارت واستعاراتی تراکیب (ص ۱۰۲) تعلّی (ص ۸۴، ص ۹۹، ص ۱۰۰ اوص ۱۰۴) بھی ان کے یہاں آمد کی شان کے ساتھ اپنے اپنے صناعاتی جلوے دکھاتی ہے۔

امید قوی ہے کہ اس مجموعہ کی مقبولیت ان کے حصہ میں حد سے سوا آئے گی اور نہ صرف آج اسے خرید کر پڑھا جائے گا اور عوامی و نجی کتب خانوں میں محفوظ کیا جائے گا بلکہ آئندہ بھی بہار میں رباعی کی تاریخ پر لکھنے والے اس کی تلاش کریں گے۔ ❁❁

ببول کا سایہ (ص ۵۰ سے آگے)

آواز جیسے حلق میں اٹک گئی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ لوگ کیا کہہ رہے ہوں گے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ چاہ رہا تھا کہ پوچھ کر اپنی ماں کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا کر دے۔ اس نے شکستہ جہاز کے تختوں کی طرح ڈوبتے ابھرتے دل کے ساتھ پوچھا:

''وہ لوگ کیا کہہ رہے تھے امی جان!''

''بیٹا، وہ کہہ رہے تھے کہ ہم اس لڑکے سے اپنی بیٹی کا بیاہ کر کے اپنے خاندان کو داغ دار نہیں کرنا چاہتے جس کا باپ شرابی، جواری اور عیاش تھا۔''

ماں نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ماں کے لبوں سے نکلا ہر لفظ اُس کے ذہن پر پتھر بن کر برسا اور اُس کے سینے میں جیسے جوالامکھی پھٹ پڑا جس کی حدت اس کے لئے ناقابل برداشت تھی تاہم ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ اندر کی اذیت دہ تپش کو ضبط کرتے ہوئے بولا:

''امی جان......! لوگ کہتے ہیں تو کہنے دیجئے، یہ ان کا حق ہے، آپ برا نہ مانئے، میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ میں نے......''

''نہیں بیٹا، نہیں!'' ماں نے اُس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

وہ سوچنے لگا۔ یہ دنیا کے لوگ نجانے کب تک ایک بیٹے کو اس کے بدچلن باپ کے کرتوتوں کی سزا دیتے رہیں گے۔ اُس کے کانوں میں اپنے مرحوم باپ کی آواز گونجی:

''بیٹا! میں یہ سب کچھ تیرے لئے ہی تو کر رہا ہوں، صرف تیرے لئے......'' باپ کی یہ بات اب اس کے لئے اذیت ناک صدائے بازگشت بن گئی تھی...... ❁❁

جواہر پارے

☆ خدا سے جب بھی مانگو، مقدر مانگو، عقل نہیں کیوں کہ بہت سے عقل والے مقدر والوں کے دست نگر ہوتے ہیں

☆ جھوٹ کا بھی ایک ذائقہ ہوتا ہے خود بولیں تو وہ میٹھا لگتا ہے اور دوسرے کی زبان سے نکلے تو کڑوا

☆ انسان اپنی غلطی پر اچھا وکیل تو ضرور بن جاتا ہے، مگر دوسروں کی غلطی پر وہ ہر حال میں جج بننا چاہتا ہے

☆ خاموشی ایک نعمت ہے، خاص طور سے اُس وقت جب اختلافات زیادہ ہوں، ہر طرف آوازیں بلند ہو رہی ہوں اور علم کی کمی ہو اور دلیل کی کوئی اوقات نہ رہے

☆ یہ دنیا بھی کتنی عجیب ہے جو ایماندار کو بے ایمان، بے وقوف کو عقلمند اور بے حیا کو خوبصورت کہتی ہے

☆ غرور اور نفرت کا نشہ سراب سے بڑھ کر ہوتا ہے اور جو اس نشہ میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ جلد ہوش میں ہیں آتا

☆ ''زبان وادب'' فروری ۲۰۲۴ء نظر نواز ہوا۔ اس شمارے میں ''ذکر غالبؔ'' کے تحت اگرچہ صرف چار مضامین ہیں، لیکن یہ سبھی مضامین بہرحال پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالبؔ کے عقیدے کی بحث بہرحال ایک علمی بحث ہے اور ڈاکٹر علی عباس امیدؔ نے مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے ''غالبؔ کا عشق حقیقی'' دکھاتے ہوئے یہ بحث بہت استدلالی اور بہت ہی سنجیدہ انداز میں قلم بند کیا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے یہ مقالہ علمی بحث وتمحیص کے دروازے کھول سکتا ہے، مگر یہاں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی پیش کش میں علمی شان وشوکت سے انکار نہیں ہوسکتا۔ محترمہ شبانہ عشرتؔ کے مقالہ ''بخت غالبؔ'' نے بھی خصوصیت سے متوجہ کیا، ایک تو مقالہ کا انداز اور ترتیب بیان اور دوسری چیز کچھ خصوصی حوالے کا اہتمام، میرا خیال ہے کہ تنقیدی کتابوں کے حوالے کے ساتھ تقویمی کتابوں میں موجود مواد سے استفادہ میں بھی کچھ حرج نہیں بلکہ اس سے ایک قسم کی ندرت کا احساس ہوتا ہے۔ ''غالبؔ کی صوفیانہ شاعری'' پر جناب نجم الزماں نے ایک نظر ڈالتے ہوئے جس نکتہ کی نشاندہی کی ہے، اس سے انکار ممکن نہیں، ہاں! یہ ضرور ہے کہ غالبؔ کی صوفیانہ شاعری میں کم کم ہی سہی کیف تصوف سے قربت بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ محترمہ ثنا ثمرین کا مضمون ''غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور'' طلبا وطالبات کے لئے خاص طور سے نفع بخش ہے۔ انہوں نے غالبؔ کے ''انداز بیاں اور'' کی بات صرف شاعری تک رہنے دی ہے، اس میں کچھ مضائقہ بھی نہیں، مگر میرا خیال ہے کہ نثر یعنی خطوط میں بھی غالبؔ کا ''انداز بیاں کچھ اور'' ہی ہے اور تھوڑا سا اس رُخ سے بھی وہ لکھ دیتیں اور مراسلہ کو مکالمہ بنانے کا ذکر آجاتا تو ایک گوشہ بالکل تشنہ رہ جانے کا شاکی نہ ہوتا۔ ''مقالات'' کے حصہ میں یوں تو سبھی تحریریں عمدہ اور کامیاب ہیں، لیکن خاص طور سے ''۲۰۲۳ء کے افسانوی اور افسانچوں کے مجموعے'' پر پروفیسر اسلم جمشید پوری کا مقالہ واقعی دستاویزی نوعیت کا مقالہ ہے اور حاصل شمارہ، پھر ڈاکٹر محمد ذاکر حسین ندوی کا مقالہ ''رسالہ 'عفت' میں شررؔ اور شادؔ کی وفات کا ذکر'' بھی اپنی کامیاب تحقیقی نوعیت کا احساس دلا گیا۔ املا کی صحت پر توجہ نہایت ضروری امر ہے، اس لحاظ سے اس شمارے میں ''املا نامہ'' کے تحت ڈاکٹر اسلم جاوداں کی تحریر بھی اپنی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلا رہی ہے۔ بیشک لفظ کی قوت سے انکار ممکن نہیں، اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ تلوار کا زخم بھر جاتا ہے، زبان کا زخم نہیں بھرتا۔ اس رُخ سے جناب شاکر کریمی کا افسانہ ''زہر میں میں بجھا ہوا تیر'' یقیناً کامیاب ہے اور اسی طرح افتخار عظیم چاند کا افسانہ ''اور ان کا ساتھ چھوٹ گیا'' بھی یہ دکھانے اور بتانے میں کامیاب نظر آیا کہ فکر کی تطہیر کس طرح نازک وقت میں انسان کو غریق معصیت ہونے سے بچا لیتی ہے۔ اس شمارے میں ''منظومات'' کا حصہ بھی بھرپور اور کامیاب ہے اور ''کتابوں کی دنیا'' بھی مبصرین کی محنت اور ژرف نگاہی کا احساس دلا رہی ہے۔ افسوس منورؔ رانا بھی رخصت ہوئے، اللہ بس باقی ہوس! امومت اور مہاجرت جیسے موضوع کے حوالے سے ان کی شاعری مدتوں یاد رکھی جائے گی۔ ''بچوں کا زبان وادب'' بھی اپنے مشمولات کی کامیابی کا احساس دلا رہا ہے۔ دعا ہے کہ اکادمی مجلّہ ''زبان وادب'' یوں ہی ترقی اور مقبولیت کی منزلیں طے کرتا رہے۔ آمین!

توصیف احمد، مظفرپور

☆ مرزا غالبؔ کی تصویر اور اُن کی تحریر کے عکس سے سجے سجائے سرورق کے ساتھ، ماہ فروری ۲۰۲۴ء کا ''زبان وادب'' باصرہ نواز ہوا۔ سب سے پہلے تو ذرا دیر کے لئے غالبؔ کی دستی تحریر پر ہی نظر ٹک گئی۔ غالبؔ کی اِس تحریر میں سجاعت کا رنگ تو ہے ہی، لکھنے کا طرز بھی اپنے عہد کا آئینہ دکھا رہا ہے کہ آج سے لگ بھگ ڈیڑھ سو سال پہلے کس طرح لکھا جاتا تھا۔ بہرکیف! اس میں شک نہیں کہ ''ذکر غالبؔ'' کے حصہ نے اس شمارے کو خاصا وقیع اور جاندار بنا دیا ہے۔ ''مقالات'' میں پروفیسر

اسلم جمشید پوری کی محنتوں کا اعتراف لازم ہے۔ ''۲۰۲۳ء کے افسانوی اور افسانچوں کے مجموعے'' پر انہوں نے گویا قارئین کو بڑی ہی تازہ دستاویزی سوغات سے نوازا ہے۔ ''افسانے'' اور ''منظومات'' کا حصہ بھی کامیاب اور پسندیدہ ہے۔ کتابوں پر تبصرے بھی متوازن نظر آئے۔ بچوں کا حصہ اور اندرونی سرورق کا اہتمام بھی خوب ہے۔

حشمت آرا سید، آرہ

☆ ماہ فروری ۲۰۲۴ء کا ''زبان وادب'' ملا۔ اس شمارے میں بھی ''بچوں کا زبان وادب'' بہت ہی خوب ہے۔ پرچہ کا سرورق اور ابتدائی کچھ اوراق تو رنگین ہیں ہی، بچوں کا حصہ بھی شروع سے آخر تک رنگین اور دیدہ زیب ہے اور اس کی شروعات جناب رضوان احمد بارہ بنکوی کی کہانی ''مرجھایا ہوا پھول'' سے ہوئی ہے۔ کہانی پڑھ کر خیال آیا کہ آج اللہ کے فضل سے ہم لوگوں کا بچپن کتنا خوش حال ہے، اسی کے ساتھ فرید کی حالت کا احساس کر کے دل دُکھی بھی ہونے لگا، مگر اس کی خودداری کو سلام! اور شاید یہی اس کہانی کا پیغام بھی ہے کہ غریبی میں آدمی کو بہرحال اپنی خودداری کی حفاظت کرنی ہی چاہئے۔ اپنی محنت پر بھروسہ اور اپنی محنت کی کمائی سے ہی پریشانی کے دن بدلتے ہیں۔ یہ کہانی سچ مچ دیر تک ذہن پر اپنا اثر بنائے رہتی ہے۔ جناب امتیاز احمد انصاری نے ''انسانی بال'' کے بارے میں بھی کئی طرح کی بہت مفید اور معلوماتی باتیں بتائی ہیں اور اسی طرح جناب شرف الہدیٰ کا مضمون بھی قدیم اور تاریخی نالندہ یونیورسٹی کے بارے میں بہت ساری دلچسپ معلومات دے رہا ہے، جیسے اپنی زبان دانی کا مظاہرہ کرنے والے کی عزت افزائی کا طریقہ کہ ان کو قیمتی زیورات سے آراستہ کر کے ہاتھی پر بیٹھایا جاتا تھا۔ اس مضمون میں میری دلچسپی اس لئے بھی رہی کہ مجھے راجگیر جانے اور وہاں کے کھنڈرات دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، پھر ''سوچنے کی عادت اور اس کے فائدے'' پر جناب سید تنویر احمد کا مضمون بھی بہت پسند آیا۔ بالکل ٹھیک! بچے ہوں یا بڑے، زندگی میں غور وفکر کی عادت ہی سے ترقی اور کامیابی کے راستے ملتے ہیں۔ آپ نے اس شمارے میں ''سخاوت'' پر جو چھوٹا سا فیلر دیا ہے اسے پڑھنے سے بھی بہت سی کام کی باتیں سامنے آئیں اور بہت سے نازک معاملے کا فرق سمجھنے کا موقع ملا۔ اس بار اگرچہ صرف دو ہی نظمیں پڑھنے کو ملیں، مگر یہ بہت اچھی نظمیں ہیں۔ تلوک چند محرومؔ اپنی نظم میں کتاب سے مخاطب ہیں اور ان کی یہ تمنا، گویا ہم سب کے دل کی دائمی تمنا ہے کہ ؎

آ ، اے کتاب آ ، میری پیاری کتاب آ
آ ، جلد میرے ہاتھ میں آجا ، شتاب آ
آنکھوں کے سامنے میں رکھوں تجھ کو کھول کے
بہلا تو میرے دل کو ذرا بول بول کے
جو راز تیرے دل میں ہیں وہ میرے دل پہ کھول
تجھ میں زباں نہیں ہے تو میری زباں سے بول

بچوں کے اس حصہ کی دوسری نظم ''غالبؔ کون......؟'' بھی بہت اچھی لگی۔ آپ نے بڑوں کے حصہ میں ''ذکر غالبؔ'' رکھا ہے تو یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ اس حوالے سے آپ نے بچوں کو بھی بھلایا نہیں ہے۔ فروری کا مہینہ غالبؔ سے منسوب ہے اور انہیں کے بارے میں نثار اعظمی کی نظم کے ساتھ یہ حصہ اختتام کو پہنچا ہے۔ یہ نظم اپنے موضوع پر بہت کامیاب ہے اور گویا اس میں غالبؔ کی زندگی، شخصیت، ان کی شاعری اور خطوط نگاری کے بارے میں تمام ضروری اور بنیادی معلومات نے جگہ پالیا ہے۔ نظم کے آخری اشعار میں شاعر نے جو پیغام دیا ہے، وہ سچ مچ بڑا پیغام ہے کہ ؎

اپنے اخلاق و ادب سے ، علم سے
جیتنا ہے دل تمہیں ہر فرد کا
تم بھی ایسے کام دنیا میں کرو
جن میں ملک و قوم کا ہوئے بھلا
اس طرح دنیا میں تم ہوگے اَمر
نامِ غالبؔ کو ملی جیسے بقا

خدا کرے ''بچوں کا زبان وادب'' اسی طرح اچھی اچھی سوغات کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں آتا رہے۔ آمین

عاقب محمد، دہلی

☆ نئے سال کے ''زبان وادب'' کا پہلا شمارہ ہمدست ہوا۔ شادؔ کی

ذہانت اور غلام سرور کی صحافت سے مزین یہ شمارہ خوب ہی نہیں بہت خوب ہے۔ ''حرف آغاز'' سے لے کر نظم ''سردی کا موسم'' تک سبھی کچھ جاذب نظر بھی ہے اور جالب نظر بھی۔ ولیؔ کاکوی کو پڑھتے ہی مجھے ظفرؔ رضوی کاکوی مرحوم کی یاد آ گئی۔ صفحہ نمبر ۴۲ پر درج چھ سطری نصیحت زندگی کو کامیاب وکامران بناسکتی ہے اور اسی طرح صفحہ نمبر ۷۷ پر باکس کے چھ ستارے بھی حیات انسانی کوتابناک بناسکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ ہم اس پر بصد خلوص عمل پیرا ہوں۔ اس شمارے میں نعت، نظم نیز غزلوں نے بھی کافی متاثر کیا۔ مرحوم مانوسؔ سہسرامی صاحب کی تصویر دیکھتے ہی ان کا ماضی یاد آ گیا۔ وہ روزانہ میرے گھر کی طرف سے یعنی محلّہ کرن سرائے ہوتے ہوئے کچہری جایا کرتے تھے۔ وہاں وہ چشمہ کی دکان لگایا کرتے تھے۔ اس سے قبل مرحوم بیڑی بنایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جس کو بڑا بناتا ہے کوئی نہ کوئی بے مثال خوبی سے نواز دیتا ہے۔ نمونہ کے طور پر اس شمارہ میں شامل ان کی غزل کا انتخاب بھی عمدہ ہے۔ جب ان کا انتقال ہوا، اس وقت میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ مانوسؔ صاحب کا ترنم بہت خوبصورت تھا۔ وہ اپنے سننے والوں کو کافی محظوظ کیا کرتے تھے۔ ان کی تصویر دیکھ کر شوقؔ سہسرامی، کیفؔ سہسرامی، سیفؔ سہسرامی، مخمورؔ سہسرامی، شاہینؔ سہسرامی، دردؔ سہسرامی، ذوقؔ سہسرامی اور نازشؔ سہسرامی کی یاد تازہ ہوگئی۔ انہی معززین ومرحومین کو مشاعروں میں سن سن کر میں نے بھی تک بندی کرنا شروع کر دیا جو آج بھی تک بندی ہی تک محدود ہے، حالانکہ شعر کہنے کی خواہش میری بھی ہوتی ہے۔

شکیلؔ سہرامی، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' کے شمارے ماہ بہ ماہ مل رہے ہیں۔ ادھر آپ نے شمارے میں جو خوشگوار تبدیلیاں لایا ہے، اس کا احساس ہر تازہ شمارے کے ساتھ دوچند ہو جاتا ہے۔ پچھلے دنوں جنوری ۲۰۲۴ء کا شمارہ ملا تھا، مگر افسوس کہ بعض مصروفیت نے مکتوب بھیجنے سے روک رکھا۔ اس شمارے کا اہم ترین حصہ تو وہی ہے جو ''ذکر شادؔ'' کے تحت شامل ہوا ہے۔ جناب محمد شوکت جمال کا شادؔ پر مضمون تو بہت ہی خاص ہے۔ اب کسی مقالے کے لئے ایسی ژرف نگاہی سے موضوع کا انتخاب اور ایسی محنت سے مواد کی یکجائی بہت کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ محترمہ گل آفرین نے شادؔ عظیم کی رباعیاں سچ مچ وسیع کینوس میں رکھ کر دیکھنے اور دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ شادؔ کی رباعیوں میں اصلاً ابنائے دوراں کی شکایتوں کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ البتہ اس مضمون میں چاہے قلم کا سہو ہو یا کمپیوٹر کے بٹن کا کرشمہ، بہرحال ایک جگہ غلطی ہوگئی ہے اور وہ غلطی یہ ہے کہ ۱۸۴۶ء کی بجائے ۱۸۸۶ء چھپ گیا ہے۔ بہرکیف اس سے قطع نظر مضمون کا مرتبہ اپنے موضوع کی وضاحت کے لحاظ سے مسلم ہے۔ ''یاد غلام سرور'' کے تحت ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا مضمون بہت ہی جامع کہلانے کا حقدار ہے۔ دیگر ''مقالات'' بھی اپنے اپنے انداز میں موضوعی رنگارنگی اور خاطر خواہ مواد کی فراہمی کا احساس دلاتے ہیں، خاص طور سے ''مابعد جدیدیت'' پر جناب الطاف احمد کا مضمون بہت اچھا ہے، یقیناً جدیدیت کے مقابلے میں مابعد جدیدیت کے بیانیہ نے اپنی بہتر پہچان بنائی ہے۔ افسانوں میں ''فطرت کا تقاضا'' نے بہت قریب سے متاثر کیا۔ شعری حصہ بھی بہت خوب ہے۔ سیمابؔ اور صباؔ کے ''قطعات تاریخ'' اپنی دستاویزی تقویمی نوعیت رکھتے ہیں۔ کتابوں پر تبصرے بھی کسی تشنگی اور سہل پسندی کا احساس نہیں دلاتے۔ بچوں کے تعلق سے محترمہ بینش فردوس کی تحریر ''آواز کے لچھن'' اور پھر محترمہ نزہت پروین نزہتؔ کی کاوش ''سعدیؔ شیرازی'' بہت مفید اور معلوماتی ہے۔ زیادہ نیک تمنائیں۔

محمد زبیر احمد، بیگوسرائے

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا

زبان وادب

☆	بوڑھی گھوڑی لال لگام	ڈاکٹر قیصر زاہدی	۷۴
☆	ماہِ رمضان	عبدالرزاق دلؔ کھولاپوری	۷۵
☆	ایک دوا کی کہانی اُس کی اپنی زبانی	عائشہ رفعت	۷۶
☆	ابو سے محبت	فاطمہ خان	۷۷
☆	مولائے کائنات نے فرمایا......	محمد علی رضا	۷۸
☆	موبائل کا استعمال	ادیبہ حیات شفا	۷۹
☆	پہلا روزہ	صباؔ نقوی	۸۰

ڈاکٹر قیصر زاہدی
Loharwa Ghat, Alamganj, Patna - 800007 (Mob. 9525089142)

بوڑھی گھوڑی لال لگام

بچو! آپ نے محاورے، مقولے اور کہاوت یا ضرب المثل جیسی اصطلاح یقیناً سنی ہوگی، اپنی نصاب کی کتاب میں اس کی مثالیں بھی پڑھی ہوں گی اور امتحانات میں محاورے اور کہاوتوں کے مفہوم بتانے والے سوالات کے جواب بھی لکھے ہوں گے۔

کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ یہ ضرب الامثال یا کہاوتیں کس طرح وجود میں آئیں؟ اگر نہیں! تو آج میں آپ لوگوں کو بتاتا ہوں کہ ہر ضرب المثل یا کہاوت کے پیچھے کوئی نہ کوئی واقعہ یا کہانی پوشیدہ ہوتی ہے اور پھر وہ اس قدر زبان زد خاص و عام ہو کر مشہور و مقبول ہو جاتی ہے کہ تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ عورت، مرد، بچے، بوڑھے سبھی بوقت ضرورت اسے استعمال کرتے ہیں۔ آپ یہ بھی ذہن نشیں کر لیں کہ دنیا کا کوئی بھی خطہ یا کوئی بھی زبان اس سے عاری یا مبرا نہیں ہے۔ ہر ملک اور ہر زبان میں اس کا استعمال رائج ہے۔ یہ محاورے یا ضرب المثل زباں کو نہایت دلچسپ اور بامعنی بناتے ہیں۔ چند الفاظ میں آسانی سے بڑی سے بڑی بات کہہ دی جاتی ہے جس سے ایک نیا مفہوم بھی نکل آتا ہے اور سننے والوں کے ذہن پر بوجھ بھی نہیں پڑتا ہے۔ مثلاً ''بڑے میاں سو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ''، ''آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا''، ''اندھا گائے، بہرا بجائے'' وغیرہ وغیرہ۔

بچو! اسی طرح آپ نے یہ ضرب المثل بھی ضرور سنی یا پڑھی ہوگی کہ ''بوڑھی گھوڑی لال لگام'' کیا آپ کو معلوم ہو کہ یہ ضرب المثل کس طرح وجود میں آئی یا سب سے پہلے اس ضرب المثل کو کس نے اور کب استعمال کیا تھا؟ اگر آپ کو نہیں معلوم تو آج میں اس راز سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں۔

برسہا برس پہلے کی بات ہے، کسی گاؤں میں ایک نہایت ہی نیک اور سیدھی سادی بیوہ عورت زندگی بسر کر رہی تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد وہ اپنے آٹھ سال کے بیٹے کی اچھی تعلیم و تربیت کے لئے کافی محنت و مشقت کرتی۔ بس اسی امید پہ وہ زندہ تھی کہ جب ایک دن اس کا بیٹا بڑا ہو کر کسی لائق بن جائے گا تو اسے زیادہ محنت و مشقت نہیں کرنی پڑے گی۔ گھر میں ایک خوبصورت اور نیک بہو بھی آ جائے گی۔ بیٹا کما کر لائے گا اور بہو گھر کا کام کاج سنبھال لے گی، تب اس کی بقیہ زندگی آرام سے گزرے گی۔

جب اس کا بیٹا جوان ہو گیا اور روزگار سے لگ گیا تو اس بوڑھی نے گاؤں کی ہی ایک خوبصورت لڑکی سے اپنے بیٹے کی شادی کر دی اور اسے بہو بنا کر اپنے گھر لے آئی، مگر چند ہی ہفتے میں اس کا خواب چکنا چور ہو گیا، کیونکہ بہو کو گھر کے کام کاج سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو بس ہر وقت اپنی آرائش و زیبائش میں ہی مشغول رہتی۔ وہ نہایت زبان دراز بھی تھی۔ اب ساس بیچاری کیا کرتی، بس اپنی قسمت کو کوستی اور سوچتی کہ کاش وہ اس کی ظاہری صورت نہیں بلکہ سیرت دیکھ کر فیصلہ کرتی تو آج یہ دن نہیں دیکھنا پڑتا۔

چند ماہ بعد گاؤں کے زمیندار کے بیٹے کی شادی تھی۔ زمیندار نے اپنے بیٹے کی شادی میں جہاں گاؤں کے سارے لوگوں کو مدعو کیا تھا وہیں اس بوڑھی عورت اور اس کے بیٹے بہو کو بھی بلایا تھا۔

اس بوڑھی عورت نے سوچا کہ زمیندار کے بیٹے کی شادی کی تقریب میں ایک سے بڑھ کر ایک لوگ شامل ہوں گے۔ اگر وہ معمولی کپڑوں میں جائے گی تو امیر گھرانے کی عورتیں اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھیں گی، کیوں نہ میں بھی اچھے لباس زیب تن کر کے جاؤں، لہٰذا یہ سوچ کر اس نے اپنی جوانی کے دنوں کی ایک خوبصورت رنگین ساڑی نکال کر زیب تن کر لی اور نہایت دلکش انداز میں اپنے بالوں کو بھی سنوار لیا۔ یہ سب دیکھ کر اس کی بہو جل بھن گئی۔

عبدالرزاق دلؔ کھولاپوری

At.P.o. Kholapur, Taq. Bhatkuli, Dist- Amravati - 444802 (Mob. 7304485318)

ماہِ رمضان

شاداں ہیں سبھی ماہِ رمضان سے
منتظر اِس کے تھے لوگ شعبان سے

بچو! ہیں آپ بھی خوش و خرم تمام
روز ہے سحر و افطار کا اہتمام

شام پر نور ہے صبح ہے پرسکوں
دل یہ چاہے ، رکھو روزہ ، سب سے کہوں

بعد عشاء مسجدوں میں تراویح ہوئی
نیکیاں پایا وہ جس نے کی یہ سعی

کر کے سحری نہ غفلت میں سونا میاں
قیمتی وقت کو یوں نہ کھونا میاں

گھر میں تم روزہ داروں کا رکھنا خیال
اُن کو ہو نہ کسی پل بھی رنج و ملال

وہ جو روزہ نمازوں کا پابند ہو
اس سے ہرگز زیادہ نہ تم کام لو

دلؔ جو تم سے خفا اور ناراض ہو
میرا روزہ ہے بھائی ، یہ اس سے کہو

❁❁❁

تھوڑی دیر بعد شادی کی تقریب میں شامل چلنے کی غرض سے اس کی بہو کی ایک سہیلی آ گئی۔ سہیلی نے جو آج بوڑھی کو رنگین لباس میں دیکھا تو اس نے بہو سے کہا کہ:

''آج تو تمہاری ساس رنگین لباس میں کافی خوبصورت نظر آ رہی ہیں۔'' سہیلی کی بات سنتے ہی بہو منھ ناک سکوڑ کر بولی:

''ہونہہ خوبصورت نظر آ رہی ہے۔ بوڑھی گھوڑی لال لگام''

''کیا......؟''

''بوڑھی گھوڑی لال لگام'' اور پھر دونوں زور زور سے ہنسنے لگیں۔ اسی پر بس نہیں ہوا، پھر جب بہو کی سہیلی شادی کی محفل میں پہنچی تو وہ اپنی دوسری سہیلیوں کو بھی خوب مزے لے لے کر سنانے لگی:

''میری سہیلیو سنو سنو۔ ''بوڑھی گھوڑی لال لگام'' اور پھر خوب قہقہے لگاتی......ہاہا......ہاہا......

چند ہی دنوں میں یہ فقرہ نہ صرف پورے گاؤں میں مشہور ہوا، بلکہ جلد ہی قرب و جوار کے گاؤں سے ہوتے ہوئے ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچ گیا اور آج یہ فقرہ ضرب المثل کے طور پر آپ تک بھی پہنچ چکا ہے، مگر خبردار بھول کر بھی کسی ضعیفہ کو دیکھ کر ہرگز مت کہنا کہ:

''بوڑھی گھوڑی لال لگام'' ورنہ اگر آپ کے ساتھ کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو اس کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔ ❁❁❁

عائشہ رفعت
Alamganj, Patna

ایک دوا کی کہانی اُس کی اپنی زبانی

پیارے بچو! مجھے اچھی طرح یقین ہے کہ آپ نے میرا نام کبھی نہ کبھی ضرور سنا ہوگا، اپنے گھر، پڑوس میں بھی اور خاص طور پر دواخانے میں، کسی ڈاکٹر کی زبان سے بھی، ہوسکتا ہے کہ انگریزی دوا کے کسی نسخہ پر آپ نے میرا نام لکھا ہوا بھی دیکھا ہو۔ میری عمر اوروں کے مقابلے بہت زیادہ تو نہیں، پھر بھی اب سو سال ہونے ہی کو ہے، اس لئے کہ ۲۰۲۴ء میں آپ سے میری باتیں ہو رہی ہیں اور میرے پیدا ہونے کا سال ۱۹۲۸ء ہے۔ میں نے اپنے ''پیدا ہونے'' کا سال بس آپ کے سمجھنے کے لئے کہہ دیا، نہیں تو مجھے اصل میں ''ایجاد ہونے'' کا سال کہنا چاہئے تھا، کیوں کہ میں انگریزی علاج کی دنیا میں ایک ایجاد ہی تو ہوں، مگر بہت اہم اور بہت ہی مشہور ایجاد۔

مجھے ایجاد کرنے والا شخص ایک دیہاتی آدمی تھا۔ اسکاٹ لینڈ کے دیہات میں رہنے والے ایک غریب کسان کا بیٹا۔ مجھے یاد ہے، جب اُسے اپنی کوششوں میں کامیابی ملی تھی، اُس وقت وہ ۴۷ برس کا تھا۔ کتابوں میں اُس کے پیدا ہونے کی تاریخ ۶ر اگست ۱۸۸۱ء لکھا ہے:

الیکزینڈر فلیمنگ

یہ ہے نام اُس ڈاکٹر کا جس کے سر پر آج بھی میری اس مثالی ایجاد کا سہرا بندھا ہے۔ وہ ڈاکٹر تو ۱۹۰۶ء میں ہی بن گیا تھا، لیکن اُسے جیسا کہ میں نے بتایا، مجھے ایجاد کی دنیا میں لاتے لاتے لگ بھگ بائیس سال اور لگ گئے، مگر میں سوچتی ہوں، اس میں حیرت کی کیا بات ہے، اس لئے کہ لگاتار محنت اور کسی مقصد پر دھیان اور وقت دیتے رہنے ہی سے تو آدمی کامیابی کی منزل تک پہنچتا ہے اور پھر اپنے کارنامے کی بدولت مرنے کے بعد بھی دنیا میں اَمر ہوجاتا ہے۔

عزیز بچو! یہ سن کر شاید تمہیں ہنسی آجائے کہ جس شخص نے مجھے ایجاد کیا، اُسے کیڑے مکوڑوں کے بارے میں جانکاری لیتے رہنے کا بچپن ہی سے بڑا شوق تھا۔ وہ ہر چیز کو جستجو کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اُس زمانے میں اگر کسی کو نمونیا ہوجاتا یا زخم نکل آتا یا کسی کا آپریشن ہوتا تو اسے اچھا ہونے میں بہت وقت لگتا تھا اور بہت مشکل ہوتی تھی اور ایسے بیماروں کو دیکھ کر فلیمنگ برابر یہی سوچا کرتا تھا کہ کوئی ایسی دوا ہونی چاہئے جو ایسے بیماروں کو جلد سے جلد اچھا کر سکے۔

اُس وقت وہ اپنی پڑھائی کے اسکولی دور میں تھا اور اس کی عمر بھی تیرہ، چودہ سال سے زیادہ نہیں تھی، مگر اس کے ذہن میں ایک خواہش نے اپنا مستقل گھر بنا لیا تھا اور وہ خواہش وہی تھی جس کا ذکر میں نے ابھی کیا۔ وہ غریب گھر کا غریب لڑکا تو تھا ہی، آگے پڑھنے کے لئے جب لندن آیا تو اس شہر کی گرانی نے اسے اور بھی غریب بنا دیا، مگر وہ اپنی دھن کا پکا تھا، کچھ دنوں اس کی پڑھائی رکی، مگر آخر کار ہر طرح کی مشکلیں جھیل کر بہر حال دس سال ہوتے ہوتے اس نے ڈاکٹری کا کورس مکمل کر لیا اور پھر چند سال ہوتے ہوتے اُسے لندن کے سینٹ مورے ہسپتال میں نوکری مل گئی اور سر المروتھ رائٹ کا اسسٹنٹ بن کر جراثیم کی چھان بین کرنے والی جگہ یعنی بیکٹریولوجیکل لیباریٹری میں وہ کام کرنے لگا۔ اُسے ہر طرح آسودگی مل چکی تھی، مگر اب بھی وہ اپنے بچپن کی یہ آرزو بھلا نہیں پایا تھا کہ کوئی ایسی دوا ہوتی جس سے مریض جلد سے جلد اچھا ہوجاتا۔

پیارے بچو! ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے ''جہاں چاہ وہاں راہ''، تم نے بھی یہ کہاوت کبھی سنا ہوگا۔ فلیمنگ کی چاہ نے آخر اس کے لئے راہ نکال دیا۔ اس نے جراثیموں کی ایک پلیٹ جانچ کے لئے تیار کی جس میں بیکٹیریا بڑی تعداد میں ڈالے ہوئے تھے، پھر دوسری صبح جب وہ لیباریٹری میں آیا اور اس پلیٹ کا جائزہ لیا تو کیا دیکھتا ہے کہ جرثومے یعنی بیکٹیریا بڑی تعداد میں مر چکے ہیں اور پلیٹ ٹھیک سے

فاطمہ خان
Vill.+P.o.- Rithpur, Dist. Amravati - 444704 (Maharastra) (Mob. 9403860486)

ابو سے محبت

ماہِ رمضان المبارک کا نواں روزہ......شام کا وقت......گھر کے سارے روزہ دار بڑے ہال میں بچھے دسترخوان کے اِردگرد بیٹھے تھے۔ ہمارے گھر میں سب لوگ فرش پر بیٹھ کر ہی افطار کرتے ہیں۔صرف دادا جان کمزوری کی وجہ سے،صوفے پر بیٹھ کر روزہ کھولتے ہیں۔

دسترخوان پر افطار کا سامان رکھا ہوا تھا۔ بڑی باجی سب کو افطاری کی دُعا کے معنی بتا رہی تھیں۔اللّٰھم لك......یعنی:

اے اللہ میں نے تیرے ہی لئے روزہ رکھا تجھ پر ایمان لایا،تجھ پر بھروسہ کیا اور تیری ہی دی ہوئی روزی سے میں روزہ کھول رہا ہوں رکھول رہی ہوں۔

دادا جان اپنے کمرے میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔اس لئے ابھی تک ہال میں نہیں آئے تھے۔مسجد سے افطار کا اعلان ہوا۔سب نے دعا پڑھ کر افطار کیا۔

اسی وقت دادا جان بھی اپنے کمرے سے نکل کر ہال میں آ گئے اور صوفے پر بیٹھ گئے،مگر ان کے سامنے صوفے پر افطار کا کوئی سامان نہیں تھا۔ابو نے پلٹ کر دیکھا اور فوراً ہی اپنی افطار کے سامان سے بھری ہوئی پلیٹ ان کی طرف بڑھا دی۔اب میرے ابو کے سامنے کوئی پلیٹ نہیں تھی۔سو اسی وقت میں نے اپنی بھری ہوئی پلیٹ ان کے سامنے رکھ دی اور خود کے لئے دوسری پلیٹ لانے کو کچن میں چلی گئی۔اپنے ابو کی دادا سے محبت دیکھ کر مجھے ایسا کرنے کا خیال آیا تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ میں بھی اپنے ابو سے ویسی ہی محبت کرتی ہوں۔جیسی وہ اپنے ابو یعنی میرے دادا جان سے کرتے ہیں۔بچو! یہ محبت کا ایک سلسلہ ہے۔آج تم اپنے بڑوں کی عزت کرو گے تو کل جب تم بھی بڑے ہو جاؤ گے تو یقیناً تمہارے چھوٹے تمہاری اسی طرح عزت کریں گے اور ہر زمانے میں تمہاری قدر ہوگی۔ ❁❁

ڈھکی نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے درمیان ایک طرح کے پودے،جن کو ’’پنسیلنم نوٹائم‘‘ کہتے ہیں،اُگ آئے ہیں۔ممکن ہے پلیٹ کا ٹھیک سے ڈھکا ہوا نہ ہونا اس کی بھول کا نتیجہ ہو،لیکن اِس بھول سے اس کی چاہ کے لئے ایک راہ نکل آئی۔اس واقعہ سے اُس نے یہ نتیجہ نکالا کہ جرثوموں کی موت اسی پودے کے اثر سے ہوئی ہے،مگر یہ ایک اتفاق بھی تو ہوسکتا تھا،اس لئے اُس نے اس تجربہ کو بار بار دہرایا اور جب اُسے پورا یقین ہو گیا کہ یہ محض اتفاق نہیں ہے تو پھر اُس نے آگے کوشش کی اور آخر کار ایک دوا ایجاد کر لی۔

میں فلیمنگ کی ایجاد کی ہوئی وہی دوا ہوں۔اُس نے میرا نام اُسی پودے کے نام پر رکھا’’پنسلین‘‘(Penicillin)ڈاکٹر فلیمنگ ایک نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر گزرے ہیں۔میری ایجاد پر ہی انہیں یہ انعام ۱۹۴۵ء میں ملا تھا۔مجھے فخر ہے کہ میرے استعمال سے نہ صرف اُس زمانے میں عالمی جنگ کے بیشمار زخمی اور بیمار سپاہیوں کو کم سے کم وقتوں میں آرام ملا،بلکہ اُس زمانے کے بعد سے برابر میری ترقی ہوتی رہی اور میرا افارمولا بہتر سے بہتر بنتا رہا۔

میں اپنی کہانی سنا رہی ہوں تو اس کا مقصد اپنی برائی یا صرف اپنے بارے میں بتانا ہی نہیں ہے،بلکہ اس طرح یہ بات بھی تمہارے ذہن میں ڈالنا چاہتی ہوں کہ آدمی کو ہمیشہ اچھی سوچ رکھنا چاہئے اور صرف سوچ ہی نہیں بلکہ اس سلسلہ میں اپنی صلاحیت،محنت اور معلومات سے بھی پوری طرح کام لینا چاہئے۔ہم سب جانتے ہیں کہ خدمت خلق کا مرتبہ کیا ہے۔انسانی ہمدردی،خاص طور سے بیماروں کی راحت اور صحت کا خیال بڑی چیز ہے اور یہ کہ پیہم جستجو ہی انسانی زندگی کا راز ہے۔ ❁❁

محمد علی رضا
Gulzarbagh, Patna City

مولائے کائنات نے فرمایا.....

میرے عزیز دوستو! آج میں آپ کی محفل میں زندگی کو سنوارنے والے اقوال زریں کا بیش بہا خزانہ لے کر آیا ہوں، یہ وہ حکمت بھری باتیں ہیں جن کو انسان اپنی زندگی کا حصہ بنا لے تو ایک صالح انقلاب پیدا ہوجائے اور دین و دنیا کی سرفرازی اس کا قدم چومنے لگے۔ یہ ہیرے اس خزانے سے نکلے ہوئے ہیں جس کو کان حکمت کہا جاتا ہے اور جس کو دربار رسالت سے ''باب العلم'' کا زریں خطاب ملا ہے۔ اس سے مراد حضرت علی کرم اللہ وجہ ہیں۔

حضرت علی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے۔ بارہ برس کی عمر میں مسلمان ہوئے۔ ان کی پیدائش ۶۰۰ء میں خانۂ کعبہ میں ہوئی۔ ۱۱ر رمضان ۴۰ھ کو ابن ملجم نے انہیں شہید کیا۔ وہ حضرت فاطمہ کے شوہر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ہیں۔ وہ اسلام کے مشہور جری جرنیل تھے۔ چوتھے خلیفہ نامزد کئے گئے۔ ان کے اقوال کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، مثلاً آپ نے فرمایا:

☆ جو شخص تمہاری قدر نہیں کرتا اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔
☆ تین انسان تین چیزوں سے محروم رہیں گے۔ غصے والا صحیح فیصلے سے، جھوٹا عزت سے اور جلد باز کامیابی سے۔
☆ یہ زندگی دو دن کی ہے، ایک دن تمہارے حق میں اور دوسرے دن تمہارے مخالف، دن تمہارے حق میں ہو تو غرور مت کرنا اور تمہارے مخالف ہو، اس دن صبر کرنا۔
☆ جب تمہاری مشکلات حد سے بڑھنے لگیں تو سمجھ لو کہ خدا تمہیں بلند مقام دینے والا ہے۔
☆ زندگی میں کبھی خود کو کسی انسان کا عادی نہ بناؤ کیونکہ انسان بہت خود غرض ہے، جب آپ کو پسند کرتا ہے تو آپ کی برائی بھول جاتا ہے اور جب نفرت کرتا ہے تو آپ کی بھلائی بھول جاتا ہے۔
☆ دوست کی غلطی ریت پر لکھو تا کہ پانی اسے مٹا دے اور دوست کا احساس پتھر پر لکھو تا کہ اسے کوئی مٹا نہ سکے۔
☆ جھوٹ بول کر جیتنے سے اچھا ہے کہ تم سچ بول کر ہار جاؤ۔
☆ جب عقل مکمل ہوجاتی ہے تو گفتگو مختصر ہوجاتی ہے۔
☆ گمراہی اور سرکشی کے ساتھ فتح نہیں ہوتی ہے۔
☆ خالق سے مانگنا سنت ہے اگر وہ دے دے تو رحمت اور مہربانی اور نہ دے تو اُس کی حکمت، جب کہ مخلوق سے مانگنا ذلت ہے۔ اگر دے دے تو احسان اور نہ دے تو شرمندگی۔
☆ خدا کو ناراض کر کے لوگوں کو راضی نہ کرو کیوں کہ ایک کے بدلے دوسرے مل سکتے ہیں، مگر خدا کے بدلے دوسرا خدا نہیں ملتا۔
☆ جسے تقدیر پر یقین ہوتا ہے وہ اپنے اوپر نازل ہونے والی مصیبتوں سے نہیں گھبراتا۔
☆ اگر رزق عقل سے ملتی تو جانور اور بیوقوف زندہ ہی نہیں رہتے۔
☆ جو شخص تم پر غصہ کرے، مگر پھر بھی تعلق نہ توڑے وہ برے وقت میں تمہارا سچا ساتھی ہے۔
☆ جو دُکھ دے اسے چھوڑ دو اور جسے چھوڑ دو اسے دُکھ نہ دو۔
☆ اپنا سر اونچا رکھو کہ تم کسی سے نہیں ڈرتے اور نگاہیں نیچی رکھو تا کہ پتہ چلے کہ تم عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔
☆ جس نے اپنی قدر و منزلت پہچان لی وہ کبھی برباد نہیں ہوتا۔
☆ بے وقوف ترین انسان وہ ہے جو اپنی بدکلامی پر فخر کرتا ہے
☆ زندگی میں قسم، قدم اور قلم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہئے۔ الفاظ ہی سب کچھ ہوتے ہیں، دل جیت بھی لیتے ہیں اور دل چیر بھی دیتے ہیں۔
☆ کیسے بھی حالات ہوں، ہمیشہ دعا مانگتے رہیں کیوں کہ معجزات ہونے میں دیر نہیں لگتی۔

ادیبہ حیات شفا
C/o Book Emporium, Sabzibagh, Patna - 800004

موبائل کا استعمال

ہم لوگ آج کل جس دور میں جی رہے ہیں اسے سائنسی عہد کہا جاتا ہے۔ بیشک آج کے دور میں سائنس نے کافی تیزی سے ترقیوں کی منزلیں طے کی ہیں اور ہمیں کئی طرح کی مختلف اور کارآمد چیزیں مہیا کرادی ہیں، جیسے کمپیوٹر، ٹیلی ویژن، کپڑے دھونے کی مشین، آئرن، ریفریجریٹر وغیرہ اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں جن کا ہم لوگ دن رات استعمال کرتے ہیں۔

سائنس نے جو چیزیں ہمیں عطا کی ہیں، انہیں ہم چاہ کر بھی نظرانداز نہیں کر سکتے ہیں۔ ان ہی چیزوں میں ایک اہم موبائل فون بھی ہے۔ دیکھنے کو تو یہ ایک بہت چھوٹی سی چیز ہے، لیکن یہ انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ بن چکا ہے۔ یہ اب اتنا ضروری ہوگیا ہے کہ اگر یہ نہ رہے تو شاید انسان ایک قدم آگے نہیں چل سکے۔

یوں تو موبائل سے بہت سے کام لیے جاتے ہیں، لیکن ان میں سب سے اہم ہے خود سے دور رہنے والوں سے بات چیت کرنا، انہیں اپنی بات کہنا اور ان کی باتیں سننا۔

ایک وقت تھا جب ایک خط کو پہنچنے میں مہینوں کا وقت لگتا تھا جس کی وجہ سے کئی دفعہ کئی ضروری کام بھی وقت پر انجام نہیں پاتے تھے۔ سائنس دانوں کو اس کمی کا احساس شدت سے تھا۔ ان ہی سائنس دانوں میں سے ایک الیگزنڈر گراہم بل بھی تھے، جنھوں نے ۱۸۷۶ء میں ایک آلہ ایجاد کیا جس کے ذریعہ اپنے سے دور بیٹھے لوگوں سے بات کی جاسکتی تھی۔ اس کا نام ٹیلی فون رکھا گیا۔ اس کے بعد اس میں دن بہ دن ترقی ہوتی گئی اور آج ہم لوگوں کے پاس جو موبائل ہے، اسی کا نتیجہ ہے۔ آج ہم لوگوں کے ہاتھوں میں جو اسمارٹ موبائل فون ہے وہ شروع شروع میں ایسا نہیں تھا، یہاں تک کا سفر کرنے میں موبائل کو ایک عرصہ گزر گیا ہے۔ پہلے اس کی شکل وصورت بھی ایسی نہیں تھی۔ ٹیلی فون میں ایک خرابی یہ تھی کہ اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لایا یا لے جایا نہیں جاسکتا تھا، اسی بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے موٹرولا کے ایک انجینئر مارٹن کاپر نے موبائل فون نام کا ایک آلہ ایجاد کیا جس کا استعمال کرتے ہوئے اس نے ۳/اپریل ۱۹۷۳ء کو پہلی موبائل کال کی۔

موبائل خاص کر بڑی اسکرین والے موبائل فون کے آجانے سے ہمیں بڑا فائدہ ہوا ہے۔ ہم گھر بیٹھے اس سے کئی طرح کے کام لے سکتے ہیں۔ ہم اس میں دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھ کر پوری دنیا کی خبریں معلوم ہی نہیں کرتے بلکہ دنیا کے کس کونے میں کیا ہورہا ہے، کہاں جنگ ہورہی ہے، کہاں امن وسکون کا ماحول بنا ہوا ہے، یہ سب کچھ دیکھ بھی سکتے ہیں۔ پہلے زمانے میں دوردراز کا سفر طے کرکے لوگ دوسرے ملکوں کے کتب خانوں میں مطالعے کے لئے جاتے اور اہم معلومات حاصل کرتے تھے جس میں انہیں کئی طرح کی مشکلوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا، لیکن اب ہم لوگ دنیا کی کوئی بھی کتاب کا مطالعہ گھر بیٹھے کرسکتے ہیں اور کسی بھی زبان کی کتاب کا اپنی زبان میں ترجمہ پڑھ سکتے ہیں۔

ہم لوگ موبائل فون میں سوشل میڈیا کا استعمال بھی کرتے ہیں جیسے فیس بک، انسٹاگرام، ٹوئٹر، ٹیلی گرام، وہاٹس ایپ وغیرہ۔ اس کے ذریعہ بھی ہم لوگ دنیا بھر سے جڑتے ہیں اور اپنے پیغامات ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔

ہم لوگ یوٹیوب پر کئی طرح کے ویڈیوز بھی دیکھتے ہیں، فلمیں دیکھتے ہیں، گانے سنتے ہیں اور اس کے علاوہ مشاعرے اور مختلف طرح کے پروگرام وغیرہ۔ ساتھ ہی ہم لوگ اگر چاہیں تو اپنے پروگرام کا ویڈیو بنا کر بھی یوٹیوب پر اپلوڈ کرسکتے ہیں جو پوری دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ آج کل یوٹیوب پیسہ کمانے کا بھی اہم ذریعہ ہوگیا ہے۔ اس پر لوگ ویڈیوز ڈالتے ہیں اور جب بہت سے لوگ اس ویڈیو کو دیکھتے ہیں

صبا نقوی

پہلا روزہ

ننھا منا ، پیارا بچہ
رکھتا ہے جب ، پہلا روزہ
نو عمری میں ، سہ جاتا ہے
بھوک کی شدت ، پیاس کا غلبہ
ایک ذرا ، افطار سے پہلے
کھل اٹھتا ہے ، اُس کا چہرہ
افطاری کے بعد ، خوشی سے
کرتا ہے وہ ، شکر کا سجدہ
لیتا ہے وہ ، سب کی دعائیں
بڑھ جاتا ہے اُس کا جذبہ
روزہ کشائی کی خوشیوں سے
جھوم رہا ہے ، سارا کنبہ
ننھے منے ، روزہ دارو!
تم کو مبارک ، عید کا تحفہ
بات صبا کی ، بھول نہ جانا
دل کی طلب ہو ، خلد کا میوہ

❁❁❁

اور پسند کرتے ہیں تو اس پر کمپنی والے اشتہارات دیتے ہیں جو ویڈیو ڈالنے والوں کے لئے آمدنی کا ذریعہ بنتا ہے۔

اتنا ہی نہیں موبائل سے ہم لوگ بے شمار کام لینے لگے ہیں۔

اس موبائل نے پرانی بہت سی چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اب بہت سی چیزیں ہم لوگوں کو الگ الگ نہیں رکھنی پڑتی ہے، سب ہمارے موبائل میں موجود ہوتی ہے، جیسے کیلکولیٹر، کیمرہ، ٹی وی، ریڈیو، کیلنڈر اور ٹارچ وغیرہ لاک ڈاؤن اور کورونا کے زمانے سے موبائل ہماری پڑھائی میں بھی بہت مدد کرنے لگا ہے وہ اس طرح کہ اس موبائل سے ہم لوگ آن لائن پڑھائی بھی کرنے لگے ہیں۔ آن لائن کلاس اور آن لائن میٹنگ وغیرہ بھی ہم لوگ کرتے ہیں۔

موبائل کے فائدے ہزار، لیکن اس کے بہت سے نقصانات بھی ہیں۔ جیسے ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں اسی طرح موبائل کے بھی دو پہلو ہیں اور جس طرح کسی بھی چیز کے بے جا استعمال سے ہماری صحت پر اس کے مضر اثرات پڑتے ہیں، اسی طرح موبائل کا بھی حد سے زیادہ استعمال ہمارے لئے نقصانات کا باعث بنتا ہے۔ خاص طور سے آنکھوں پر برا اثر پڑتا ہے اور جلد ہی عینک لگانے کی نوبت آجاتی ہے۔ آج کے دور میں موبائل سے معلومات کی عادت، ہمیں اپنی معلومات پر بھروسہ اور اپنے ذہن سے کام لینے کے مزاج سے دور کرتی جارہی ہے جو اپنے آپ میں بڑا نقصان ہے۔

بیشک موبائل فون کے آنے سے ہم دنیا سے بہت قریب ہو گئے ہیں، لیکن اس سچ کو بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ پاس ہوتے ہوئے بھی ہم اپنوں سے دور ہو گئے۔ جو وقت ہمیں اپنوں کو دینا چاہئے وہ وقت ہم اپنے موبائل فون کو دیتے ہیں۔ چاہے وہ کھانے کی میز ہو یا شام کی چائے ہو، ہم اپنا پورا خالی وقت فون میں صرف کر دیتے ہیں، اس طرح سے ہمیں یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ کس ملک میں کیا ہو رہا ہے، کہاں کے لوگ کس پریشانی میں مبتلا ہیں، لیکن ہم لوگ یہ پتہ نہیں کر پاتے کہ ہمارے اپنے کس پریشانی میں مبتلا ہیں، انہیں کس چیز کی ضرورت ہے یا ہم انہیں کسی کام آسکتے ہیں تو آئیں۔ ❁❁

رباعیات

رہے محروم آخر کب تلک دست طلب اپنا
خدا کے نام اک چلو ، خدا کے نام دے ساقی
عطؔا کو چاہے تو جس حال میں رکھے وہ شاکر ہے
اسے آرام دے ساقی کہ تو آلام دے ساقی

•••

موجوں میں نہ جو چلے وہ سفینہ کیا ہے
جو تیر نہ کھا سکے وہ سینہ کیا ہے
ڈر ڈر کے اگر بچے تو کیا خاک بچے
مر مر کے اگر جئے تو جینا کیا ہے

عطؔا کاکوی

عطؔا کاکوی کا پورا نام سید شاہ عطاء الرحمٰن ہے، لیکن وہ اپنے قلمی نام سے ہی مشہور ہیں۔ ان کے والد کا نام سید شاہ غفور الرحمٰن حمؔد تھا۔ عطؔا کاکوی کا تاریخی نام ''شاہ رضوی'' ہے، جس سے ان کی ولادت کا ہجری سال نکلتا ہے۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۷ستمبر۱۹۰۴ء/ ۱۳۲۲ھ ہے اور جائے ولادت کاکو، موجودہ ضلع جہاں آباد۔ ان کے دونوں بھائی وؔلی کاکوی اور اخؔتر کاکوی بھی شاعر تھے۔ گھر کی ابتدائی تعلیم کے بعد عطؔا کاکوی پٹنہ سیٹی اسکول اور پٹنہ کالجیٹ اسکول میں داخل ہوئے، مگر ۱۹۲۰ء میں تحریک عدم تعاون کے زیر اثر انہوں نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ ۱۹۲۲ء میں گیا ضلع اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں میٹرک پاس کیا، پھر ''نیو کالج'' پٹنہ سے انٹرنس اور پٹنہ کالج سے گریجویشن کے بعد، پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں فارسی اور اردو میں ایم۔اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ قانون کے امتحان میں بھی کامیاب ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں ایل،ایس کالج، مظفر پور میں شعبہ اردو وفارسی میں لکچرر بحال ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی میں ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ علمی وادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۹۶۷ء میں صدر جمہوریۂ ہند نے انہیں سند اعزاز سے نوازا۔ ''کمالِ غزل''، ''جمالِ غزل''، ''میخانۂ غزل''، ''کاروانِ خیال''، ''گلہائے رنگ رنگ'' ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔ نثر میں ان مضامین کا سلسلہ ''غلطی ہائے مضامین'' بہت اہم ہے۔ ''مطالعہ شاؔد''، ''مطالعہ حسرؔت'' اور ''تقابلی مطالعے'' ان کی قیمتی کتابوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ وہ ''سفینہ'' کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ بھی نکالا کرتے تھے۔ عطؔا کاکوی کی وفات ۱۸مارچ ۱۹۹۸ء کو پٹنہ میں ہوئی اور مقامی شاہ گنج قبرستان میں مدفون ہوئے۔

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2026

Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Ashok Rajpath, Patna - 800004

Volume : 45 **March - 2024** **No. 03**

ایڈیٹر، پبلشر ابرار احمد خان، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶ میں

طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy, on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

Rs. 15